



Downloaded From
Paksociety.com

سیاہ حاشیہ پار مت کرو۔ ”پچھتاؤ گی۔ ایک نادیدہ آواز روکتی رہی لیکن وہ لڑکی نہ رکی۔ سیاہ حاشیہ عبور کر گئی اور تب اسے احساس ہوا کہ اپنے لیے جہنم خرید چکی ہے۔



عدینہ کاٹھ کباڑ میں اپنی پرانی ڈائریاں تلاش کر رہی ہے تو اسے ایک کتبہ ملتا ہے۔ جس پر اس کی والدہ صالحہ رفیق کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات درج ہوتی ہے۔ وہ بری طرح الجھ جاتی ہے۔ اس کی والدہ تو زندہ ہیں پھر یہ کتبہ کس نے اور کیوں بنوایا ہے۔ تب ہی اس کی والدہ صالحہ آجاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ ڈائریاں تو انہوں نے ردی والے کو دے دی ہیں۔

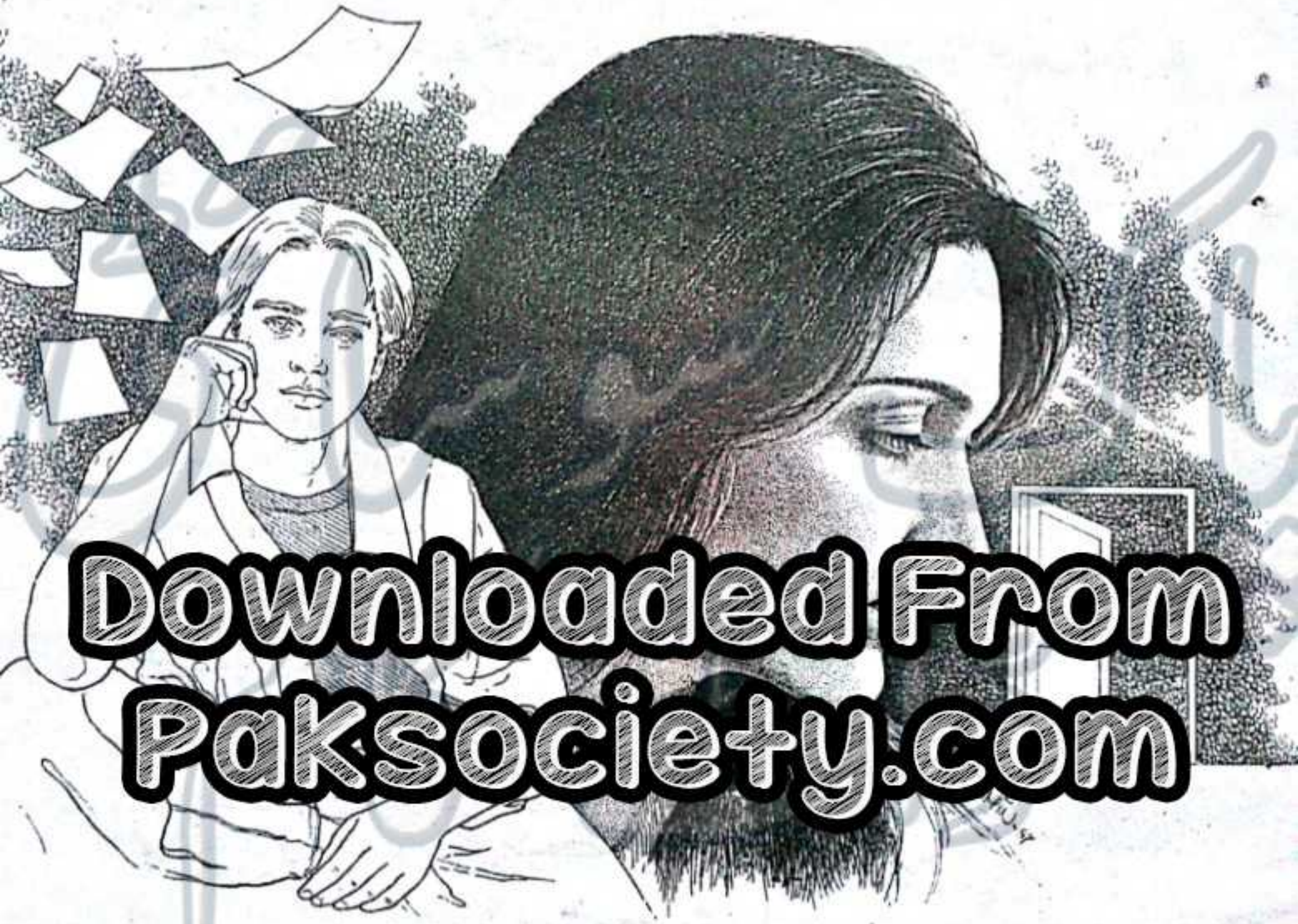
ماہنامہ شعاع اپریل 2016 226

READING
Section

www.Paksociety.com

عدینہ لو بہت دکھ ہوتا ہے پھر اسے کتبہ یاد آتا ہے تو وہ سوچتی ہے کہ عبد اللہ سے اس کے متعلق پوچھنے کی۔
 عبد اللہ پابند صوم و صلوٰۃ وہ مسجد کا موزن بھی ہے اور اس نے عربی میں ایم فل کر رکھا ہے عدینہ کی اس کے ساتھ منگنی
 ہو چکی ہے۔ عدینہ ہاسٹل میں رہتی ہے اور میڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔
 عدینہ کے والد مولوی رفیق کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ اپنی ماں سے زیادہ دادی سے قریب ہے مونا اس کی کزن ہے۔ وہ
 حویلیاں شہر سے قرآن حفظ کرنے ان کے گھر آئی ہے۔

ناولٹ



Downloaded From
 Paksociety.com

عدینہ عبد اللہ سے بہت محبت کرتی ہے۔ عبد اللہ بھی اسے چاہتا ہے لیکن شرعی اصولوں کے تحت زندگی گزارنے والی
 صالحہ آپا نے منگنی ہونے کے باوجود انہیں آپس میں بات چیت کی اجازت نہیں دی۔
 شانزے ماڈل بننا چاہتی ہے۔ ریمپ پرواک کرتے ہوئے اس کا پاؤں مڑ جاتا ہے اور وہ گر جاتی ہے۔
 ڈاکٹر بینش نیلی کو بھی میں اپنے بیٹے ارجم کے ساتھ رہتی ہیں۔ ان کے شوہر کرنل جاوید کا انتقال ہو چکا ہے۔
 نیلی کو بھی کے دوسرے حصے میں ان کے تایا ڈاکٹر جلال اپنی بیوی اور پوتی اوریدا کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کی دوشادی
 شدہ بیٹیاں ہیں اور اکلوتا بیٹا تیمور لندن میں مقیم ہے۔ بیوی کی وفات کے بعد تیمور نے اوریدا کو پاکستان اپنے باپ کے پاس
 بھجوا دیا ہے۔ بیٹا ماہیر ان کے پاس لندن میں ہے۔

ماہنامہ شعاع اپریل 2016 227

READING
 Section

اورید اور ارصم کی بہت دوستی ہے جو ڈاکٹر بینش کو بالکل پسند نہیں۔ ڈاکٹر بینش تیمور کے نام سے بھی نفرت کرتی ہیں۔
عبداللہ عدینہ کو اپنا سیل نمبر بھجوانا ہے۔ صالحہ آپادیکھ لیتی ہیں۔ وہ شدید غصہ ہوتی ہیں اور نمبر بھاڑ کر پھینک دیتی ہیں۔
سرمد اپنے دوست کے پروڈکشن ہاؤس میں جاتا ہے تو وہاں شانزے کو دیکھتا ہے۔ شانزے اس کی منتیں کر رہی ہے کہ وہ
ایک چانس اسے دے کر دیکھے۔

شانزے سخت مایوسی کا شکار ہے۔ رباب اس کی روم میٹ اسے تسلی دیتی ہے تو وہ بتاتی ہے کہ اس کا دنیا میں کوئی نہیں
ہے صرف ایک پھوپھی ہیں جن کے گھر میں اسے کوئی پسند نہیں کرتا۔ اس کی ماں اسے پھینک کر چلی گئی تھی اور باپ کو
کسی مذہبی جنونی نے قتل کر دیا۔ شانزے کا خاندان مسلمان ہے لیکن وہ کسی مذہب کو نہیں مانتی۔ ہاسٹل میں رہنے کے لیے
اس نے کالج میں داخلہ لے رکھا ہے۔ وہ شو بزم میں اپنا نام بنانا چاہتی ہے۔

آپا صالحہ نے عدینہ کی عبداللہ سے منگنی توڑ دی ہے۔ عبداللہ عدینہ سے ایک بار بات کرنا چاہتا ہے۔ عدینہ چھت پر جاتی
ہے تو عبداللہ وہاں آ جاتا ہے۔ آپادیکھ لیتی ہیں۔ وہ عدینہ کو برا بھلا کہتی ہیں اور اللہ کے عذاب سے ڈراتی ہیں۔
اورید ارصم کے ساتھ پیپر دینے جاتی ہے۔ ارصم باہر اس کا انتظار کرتا ہے۔ وہ اورید کو واپس لے کر آتا ہے تو ڈاکٹر
بینش اسے بہت ڈانٹتی ہیں کیونکہ وہ ان کی گاڑی لے کر جاتا ہے۔ اورید اپنے باپ تیمور کو یہ بات بتاتی ہے تو وہ اس کو نئی
گاڑی خرید کر دے دیتے ہیں۔ آغا جی کو یہ بات بری لگتی ہے۔

نیوی پر ایک مذہبی پروگرام دیکھتے ہوئے صالحہ آپا شدید جذباتی ہو کر رونے لگتی ہیں۔ عدینہ کو اسٹور روم کی صفائی کے
دوران ایک تصویر ملتی ہے جو کسی مرد کی ہے۔
ارصم اورید کو گاڑی چلانا سکھاتا ہے۔ اورید ا کے امتحان میں کم نمبر آتے ہیں تو وہ پریشان ہو جاتی ہے۔
مونا عدینہ کو بتاتی ہے کہ آپا نے اس کی منگنی اس لیے توڑی کہ وہ چاہتی تھیں کہ عبداللہ عدینہ سے فوراً شادی کر لے۔
عبداللہ نے فوراً شادی سے انکار کر دیا تھا۔

عبداللہ تبلیغی دورے پر جاتا ہے تو اس کا جہاز کریش ہو جاتا ہے۔ اور اس کے مرنے کی خبر آ جاتی ہے۔
عدینہ پر عبداللہ کی موت کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ وہ اپنی ماں سے بری طرح بدظن ہو جاتی ہے۔
شانزے جب بھی کوئی غلط کام کرنا چاہتی ہے کوئی حادثہ پیش آ جاتا ہے۔ رباب اسے سمجھاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے غلط
راستوں سے بچانا چاہتا ہے۔
ارسل شانزے کو زخمی ہونے پر تسلی دیتا ہے وہ بتاتا ہے کہ ایڈ میں کام کے لیے اس نے سفارش کی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ
شانزے اسے اپنا بھائی سمجھے۔
ارصم بہت اچھے نمبروں سے ایف ایس سی کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر بینش اس خوشی میں ڈنر دیتی ہیں۔
عدینہ فیصلہ سنا دیتی ہے کہ ا۔ سے ڈاکٹر نہیں بننا۔ یہ سستے ہی آپا صالحہ شدید پریشان ہو جاتی ہیں۔

تیرہویں قسط

جلال صاحب نے ناراضی سے اپنی زوجہ محترمہ کی
طرف دیکھا۔ وہ سر جھکائے اپنے پیروں کے ناخنوں کو
گھورنے میں مصروف تھیں۔ اتنا تو انہیں بھی اندازہ
تھا کہ وہ ان سے پوچھے بغیر ایک قدم اٹھا چکی ہیں۔ اب
انہیں جلال صاحب کے رد عمل کا ڈر تھا۔
تیمور کی ترسی ہوئی نگاہیں اپنے بوڑھے باپ پر جمی
ہوئی تھیں جو ان سے چند قدموں کے فاصلے پر گسی بلند
و بالا پہاڑ کی مانند ساکت کھڑے تھے اور ان کے
درمیان صدیوں کا فاصلہ تھا۔ جسے وہ چاہتے ہوئے بھی
اکیلے عبور نہیں کر سکتے تھے۔ سات لوگوں کی موجودگی
میں بھی ایک اعصاب شکن خاموشی ان کے درمیان
آکر ٹھہر گئی۔

سب ہی ایک دوسرے سے نظریں چرائے کھڑے تھے۔

”بڑے ابا کیسے ہیں آپ۔۔۔؟“ ماہیر کی آواز نے اس سناٹے کو توڑا۔ ان لمحات میں ایسی ہمت وہی کر سکتا تھا اور اس نے کی تھی۔ اس کے سوال پر سب ہی کی سوالیہ نگاہیں بڑے ابا کے چہرے کی جانب اٹھیں۔

”ٹھیک ہوں۔۔۔“ ان کا لہجہ سرد، چہرہ سپاٹ اور آنکھوں سے صاف خفگی جھلکی۔

”کہیں جارہے تھے کیا۔“ اس دفعہ سوال کرنے کی ہمت ان کی بیگم نے کی۔

”ہوں۔۔۔“ انہوں نے اپنی شریک سفر کی طرف دیکھے بغیر سر ہلایا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔ بڑے عجلت بھرے انداز میں انہوں نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور اگلے ہی لمحے انجن کی آواز پر سب لوگ بے اختیار ہی ایک طرف ہو گئے۔

”ماہیر، تم لوگ جاؤ میں کسی ملازم سے کہہ کر سامان اندر بھجواتی ہوں۔“ بڑی اماں کے چہرے پر پھیلی بڑی بے ساختہ سی شرمندگی اور مایوسی کے ملے جلے جذبات کسی سے بھی پوشیدہ نہیں رہ سکے۔ وہ بہت زیادہ ضد کر کے تیمور کو پاکستان لائی تھیں اور دل کے کسی کونے میں یہ خوش تمنہی پنپ اٹھی تھی کہ شاید اتنے سالوں کے بعد بیمار بیٹے کو دیکھ کر سرد جذبات کی برف پگھل جائے لیکن ہوا وہی تھا جس کا ڈران کے دل میں کنڈلی مارے کسی سانپ کی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ ڈاکٹر جلال نے انا اور ضد کا چولا آج بھی مضبوطی سے پہنا ہوا تھا اور اسے کسی صورت اتارنے کو تیار نہیں تھے۔

”ماہیر! اپنے بابا کو اندر لے کر جاؤ۔۔۔“ اتنے سرد استقبال پر بڑی اماں کی آنکھیں نم ہوئیں۔

”اماں! آپ تو اس طرح کہہ رہی ہیں جیسے میں پہلی دفعہ اس گھر میں آیا ہوں۔“ تیمور نے ہلکے پھلکے انداز سے کہا تو وہ پھیکے سے انداز میں مسکرا دیں۔

”ہاں بھئی، یہ عدینہ ہے نا۔۔۔“ تیمور کے

”بڑی اماں ایسا اس صدی میں تو ممکن نہیں، اگلی صدی کی ضمانت میں دے نہیں سکتا۔“ ماہیر اوریدا کو چھیڑتا ہوا سرد کے ساتھ مل کر گاڑی سے سامان نکالنے لگا۔ سرید کی نظریں بار بار بھٹک کر اوریدا کی طرف جا رہی تھیں جو اسے خاصی کمزور اور افسردہ سی لگ رہی تھی۔

”دیکھ لیں بابا! یہ آتے ہی شروع ہو گئے۔“ اوریدا نے منہ بنا کر شکایت لگائی وہ تیمور کے کندھے سے لٹکی کھڑی تھی۔

”اچھا اچھا اب یہ شکایتیں اندر جا کر کر لیتا، کھڑے کھڑے ٹانگیں شل ہو گئی ہیں میری۔“ بڑی اماں نے لاپرواہی سے اسے ٹوکا اور اندر کی جانب بڑھ گئیں۔

”یہ تم دونوں کہاں خالی ہاتھ لٹکاتی جا رہی ہو، تھوڑا سامان اٹھاؤ۔۔۔“ ماہیر نے ایک دفعہ پھر شرارت کی۔

”تو کس نے کہا تھا سارا لندن خالی کر کے آجائیں۔۔۔“ اوریدا نے ناک چڑھا کر ہزاری سے ماہیر کو جواب دیا اور عدینہ کا ہاتھ تھام کر اندر کی جانب چل دی، جب کہ ماہیر اور سرید دونوں مسکراتے ہوئے سامان نکالنے لگے۔



ہاشم اور بختاور کی زندگی شدید قسم کی مشکلات کا شکار ہو چکی تھی۔ معاشی مسائل منہ کھولے ان کی ساری خوشیاں نگٹنے کے لیے تیار تھے۔ دکانوں پر لگنے

”ایک بات کہوں، اگر برا نہ مانو تو۔۔۔“ وہ اس کے قریب آن بیٹھی اور اس بھری نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ ”کوئی تبلیغی لیکچر مت دینا پلیز!“ اس نے بھی جواباً انگلی اٹھا کر تنبیہ کی۔

”لیکچر نہیں دے رہی، اصل میں مجھے فائزہ بھابھی نے کہا ہے۔۔۔“ وہ ہلکا سا ہنسی۔

”کیا کہا ہے۔۔۔؟“ ہاشم نے ناگواری سے اسے دیکھا جو شش و پنج کا شکار ہو رہی تھی۔

”اب بول بھی دو خواہ مخواہ کی ایکٹنگ مت کرو۔۔۔“ ہاشم کی قوت برداشت آج کل بالکل ختم ہو کر رہ گئی تھی اور اس کے چہرے پر پھیلی ناگواری کو دیکھ کر بخٹاور نے کھل کر اس سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا ویسے بھی وہ ان حالات سے خود بھی خاصی دل برداشتہ ہو چکی تھی۔

”اصل میں فائزہ بھابھی کی کسی دوست کا پرائیویٹ اسکول ہے، انہوں نے مجھے آفر کی ہے کہ میں وہاں جاب کر لوں۔“ اس کے منہ سے انتہائی غیر متوقع بات سن کر ہاشم ایک لمحے کو چپ کر گیا، کچھ بھی تھا وہ بخٹاور پر معاشی ذمے داریوں کا بوجھ ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔

”مجھے معلوم تھا، تمہیں یہ بات پسند نہیں آئے گی، لیکن جیسے ہی تمہیں کوئی جاب ملے گی چھوڑ دوں گی اسے۔“ اس نے فوراً ہی اس کی سوچ پڑھ کر اپنی بات میں مزید اضافہ کیا۔

”کہاں پر ہے اسکول۔۔۔؟“ ہاشم کے لہجے میں ہلکی سی رضامندی دیکھ کر وہ پرجوش ہوئی۔

”ہیں، دو گلیاں چھوڑ کر۔۔۔“ اس نے فوراً جواب دیا۔

”اچھا ٹھیک ہے، لیکن اس سے پہلے اس بچے سے جان چھڑاؤ۔“ ہاشم کی اس بات نے اس کا سارا سکون دور ہم برہم کیا۔

”گھر میں کھانے کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ میں کسی ڈاکٹر کو دینے کے لیے فیس کہاں سے لاؤں۔؟“ وہ جھنجھلا سی گئی۔

والی آگ نے ہاشم کو ایک دن میں آسمان سے زمین تک پہنچا دیا تھا۔ ایک تو غربت اور اوپر سے بیماری نے اسے بے انتہا چڑچڑا کر دیا تھا۔ وہ بات بات پر بخٹاور سے لڑنے لگتا۔ ان حالات نے بخٹاور کی ساری دلکشی اور رنگ روپ اجاڑ کر رکھ دیا، اس کی آنکھوں کے گرد حلقے دن بہ دن سیاہ ہوتے جا رہے تھے۔ ان ہی دنوں دوبارہ اماں بننے کی خبر نے ان دونوں کو ہی خوف زدہ کر دیا۔

”مجھے نہیں چاہیے، یہ بچہ بس کسی طرح سے اس سے جان چھڑاؤ۔“ ہاشم نے سنتے ہی آسمان سر پر اٹھالیا۔

”میں کیسے جان چھڑا سکتی ہوں ہاشم، یہ گناہ ہے۔۔۔“ وہ بوکھلا گئی۔

”مجھے کسی گناہ ثواب کا نہیں پتا، میں اسے نہیں پال سکتا۔۔۔“ وہ حد درجہ مایوس اور قنوطیت کا شکار تھا۔

”ہم انسان کون ہوتے ہیں کسی کو پالنے والے، وہ رب ہے جو پوری دنیا کو پالتا ہے۔“ بخٹاور نے بڑے غلط موقع پر اسے نصیحت کی۔

”تو کہو ناں، اپنے رب کو، ہمیں چینی، گھی، دال اور گوشت دے کر جائے۔“ وہ ایک دم بھڑک کر بولا۔

”استغفر اللہ۔۔۔“ وہ فوراً ”خوف زدہ ہوئی۔“ یہ ایکٹنگ میرے سامنے مت کیا کرو۔“ اس نے بے زار لہجے میں کہا۔

”ہاشم! کیوں اتنا زیادہ مایوس ہو رہے ہو اللہ بہتر کرے گا۔“ بخٹاور رو ہانسی ہوئی۔

”میں تمہاری طرح ان خوش فہمیوں کے سہارے زندگی نہیں گزار سکتا۔“ وہ بلند آواز میں چیخا۔

”اس میں خوش فہمی کی کیا بات ہے۔۔۔؟“ اسے بھی غصہ آیا۔

”بچھلے آٹھ ہفتوں سے میں اس بیڈ پر پڑا ہوا ہوں، ادھار لے لے کر ہمارا گزارا ہو رہا ہے اور تمہاری شکرگزاری ہی ختم نہیں ہو رہی۔“ وہ متغیر لہجے میں گویا ہوا۔

آئی ہو تم۔۔۔؟“ وہ طنزیہ نگاہوں سے پالک اور میتھی کی طرف دیکھ رہا تھا وہ تین چار دن کی سبزی اکٹھی لے آئی تھی۔

”تمہارے لیے گوشت بھی لائی ہوں۔۔۔“ اس نے ہاشم کو چپ کروانے کے لیے افسردگی سے کہا۔

”تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تمہارے گوشت کا بھوکا ہوں، کبھی اچھا کھانا نہیں کھایا میں نے۔“ وہ ہمیشہ کی طرح اس کی بات میں سے غلط مطلب نکال چکا تھا۔

”میں نے ایسا کچھ نہیں کہا ہاشم، کیوں بات بات پر لڑنے لگتے ہو۔۔۔“ وہ رو ہانسی ہوئی۔

”تم میری کوئی بات نہیں مانتی ہو۔۔۔“ وہ ناراضی سے گویا ہوا۔

”مثلاً“ کون سی بات نہیں مانی۔۔۔؟“ وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

”تم ٹڈوا ٹف کے پاس کیوں نہیں گئیں۔۔۔؟“ وہ منہ پھلائے بیٹھا تھا۔

”اس دفعہ صرف پندرہ دن کی تنخواہ ملی ہے اگلے ماہ چلی جاؤں گی۔“ وہ افسردگی سے گویا ہوئی۔

”میں بتا رہا ہوں تمہیں۔۔۔“ وہ انگلی اٹھا کر دھمکی دینے کے انداز میں بولا۔ ”مجھے یہ بچہ ہی نہیں بلکہ اگلے تین چار سال تک کوئی بچہ نہیں چاہیے، جب تک میں خود اسٹیبلشمنٹ نہیں ہو جاتا۔“ اس کے ارادوں نے بخٹاور کو خوف زدہ کیا۔

”یہ کیا بات ہوئی بھلا۔۔۔؟“ وہ گھبرا کر اس کے پاس آن کھڑی ہوئی۔

”میں اپنے بچے کو نکلے نکلے کی چیزوں کے لیے نہیں ترسا سکتا۔“ اس کے پورے وجود میں تلخی رچ بس گئی تھی۔

”حالات ایک جیسے ہمیشہ تھوڑی رہیں گے، انشاء اللہ کوئی نہ کوئی سبب نکل آئے گا۔“ وہ اسے دلاسا دینے کے انداز میں بولی۔

”ایک دفعہ دکانیں سیٹ ہو جائیں تو چلو، کوئی نہ کوئی

”بے وقوف لڑکی، یہ ہی بات تو میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ یہاں اپنا گزارہ نہیں ہو رہا اور تمہیں آبادی پر بھانے کی پڑی ہوئی ہے۔“ اس کی زبان دن بہ دن تلخ اور دل دکھانے والی بن چکی تھی۔ بخٹاور ایک دم شرمندہ ہوئی جیسے اس جان کو دنیا میں لانے کی وہ اکیلی ذمہ دار ہو۔

”میں ڈاکٹر کو دینے کے لیے پیسوں کی بات کر رہی ہوں۔“ اس نے جتنی ہوئی نظروں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔

”فائزہ بھابھی سے بات کرو، کسی ٹڈوا ٹف یا لیڈی ہیلتھ ورکر کو غیرہ کے پاس لے جائیں گی تمہیں۔“ اس نے نظریں چڑا کر اس دفعہ ذرا دھیمے لہجے میں مشورہ دیا۔

”اچھا، دیکھوں گی۔“ بخٹاور نے اسے ٹالا۔

اگلے ہی ہفتے فائزہ بھابھی کے توسط سے اس کی راسیوٹ اسکول میں جاب شروع ہو گئی تھی۔ تنخواہ اگرچہ کم تھی لیکن کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر تھا، لیکن بخٹاور کو اندازہ نہیں تھا کہ یہ نوکری آنے والے دنوں میں اس کے لیے اور زیادہ مشکلات کا باعث بن جائے گی۔ ایک تو اس کی اپنی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی تھی اور اوپر سے گھر میں اکیلے رہ رہ کر ہاشم حد درجہ چیز چڑا ہو گیا تھا، وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اس سے لڑنے کے بہانے ڈھونڈتا تھا۔ اس دن بھی وہ اسکول سے واپسی پر سبزی منڈی چلی گئی۔ واپسی پر کچھ دیر ہو گئی تھی اس لیے جیسے ہی اس نے گھر میں قدم رکھا، ہاشم

اس پر برس پڑا۔

”کہاں آوارہ گردیاں کرتی ہوئی آرہی ہو، کچھ اندازہ ہے کہ سارا دن گھر میں پاگلوں کی طرح اکیلا پڑا رہتا ہوں۔“ وہ اس کے کھجور اور کھجور کے وجود سے دانستہ نظریں چڑائے اپنی بھڑاس نکال رہا تھا۔

”گھر میں پکانے کے لیے کچھ نہیں تھا، وہی لینے گئی تھی۔“ بخٹاور نے آہستہ سے کہہ کر شارپ سائیڈ میز پر رکھے

”اور یہ گھاس پھونس اور کھیت کھلیان اٹھا کر لے

تو آسرا ہو جائے۔۔۔“ وہ خود کلامی کے انداز میں گویا ہوا۔۔۔ اس کا مزاج عجیب سا ہو گیا تھا ایک دم غصے سے چیختے ہوئے فوراً ہی ٹھنڈا پڑ جاتا شاید یہ غصہ ناراضی اور تلخی اس کے وجود کی نہیں حالات کی پیدا کردہ تھی۔ بخٹاور نے تو اس کا یہ روپ یہاں آنے کے بعد ہی دیکھا تھا۔

وہ اپنی زندگی کے بدترین دور سے گزر رہی تھی۔
”اندازاً“ کتنے پیسے درکار ہوں گے۔۔۔“ بخٹاور کچھ سوچ کر اس کے قریب آئی۔

”کافی سارے۔۔۔“ اس نے منہ بنا کر جواب دیا۔
”کیا تم میری یہ گولڈ کی چین اور کچھ اور چھوٹی موٹی چیزوں کو بیچ کر گزارا کر سکتے ہو۔؟“ اس نے ہلکا سا جھجک کر کہا۔

”اب میں اتنا بھی گھٹیا نہیں ہوا۔۔۔“ اسے کرنٹ لگا۔

”جب وقت اچھا آئے گا تو میں بنوالوں گی ناں۔۔۔“ بخٹاور اس کے بالکل پاس آکر بیٹھ گئی اور نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہاشم کے چہرے پر پھیلا تناؤ تھوڑا کم ہوا۔ بخٹاور کو احساس ہوا ان دونوں کو ایک دوسرے کے پاس بیٹھ کر محبت اور نرمی سے بات کیسے پورا پورا۔۔۔ مہینہ گزر جاتا تھا۔ حالات کی تلخ دھوپ محبت بھری چھاؤں پر حاوی ہو چکی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے لڑتے لڑتے محبت کرنا بھول گئے تھے۔

”بال کتنے بڑے اور رف ہو چکے ہیں۔۔۔“ بخٹاور کو بات کرتے کرتے احساس ہوا تو وہ سرسوں کا تیل اٹھا لائی اور آہستہ آہستہ اس کے سر کا مساج کرنے لگی۔

اب یہ اس کی نرم پوروں میں رچی محبت کا اثر تھا یا ہاشم ذہنی طور پر خود سے لڑتے لڑتے تھک چکا تھا اس کے چہرے پر طمانیت کے رنگ پھیلنے لگے۔

”ہاتھ کتنے سخت ہو گئے ہیں تمہارے۔۔۔“ اس نے ایک دم ہی اس کا بازو پکڑ کر اپنے چہرے کے سامنے کیا۔ بخٹاور نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ ہاشم کی آنکھوں میں شرمندگی، اداسی اور دکھ کے سوا کچھ نہیں

”کیا ہوا۔۔۔؟“ بخٹاور کو عجیب سا احساس ہوا۔۔۔
”وقت بہت ظالم ہے۔۔۔“ وہ کسی تکلیف دہ سوچ کے زیر اثر بولا، وہ نا سمجھی کے انداز میں اسے دیکھنے لگی۔

”انسان اچھے وقتوں میں محبت کے جو بڑے بڑے دعوے زعم کے ساتھ کرتا ہے، حالات کی ایک ٹھوکر کے آگے ساری قسمیں، سارے وعدے بھر بھری ریت کی مانند ہاتھوں سے پھسل جاتے ہیں۔ وقت کی بساط پر کوئی نہیں جانتا، کسی مہرے کو کس وقت کہاں پر مات ہو جائے۔“ اس نے گہری سانس اندر کو کھینچی۔
”برا وقت خزاں رسیدہ شجر کی مانند سہی لیکن اس پر بھی امید کی کونپلوں کو پھوٹنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ شرط یہ ہے کہ اسے خلوص دل سے پانی دیا جائے۔“

اس نے اپنی انگلیوں سے اس کی کنپٹیوں کو ہلکا ہلکا دبانا شروع کیا تو ہاشم کو ایسے لگا جیسے دنیا بھر کے غم، دکھ اور رنج بھاپ بن کر فضا میں تحلیل ہو رہے ہوں اس پر ایک دل فریب سی غنودگی طاری ہونے لگی اور آج کافی مہینوں کے بعد ایک پُر سکون نیند اس کا مقدر بنی تھی۔



آپا صالحہ نے جب سے بل بورڈ پر وہ چہرہ دیکھا تھا ان کا آدھا سکون تباہ ہو چکا تھا۔ وہ آج کل نماز پڑھنے کے بعد اکثر ہی اپنی ساس کے کمرے میں بی وی کے سامنے پائی جاتیں۔ وہ اس لڑکی کو ایک دفعہ پھر غور سے

دیکھنا چاہتی تھیں جسے دیکھ کر ان کے دل کی دھڑکنیں مرتعش ہوتی تھیں۔

”آج کل کوئی نیا ڈراما نہیں آرہا کیا؟“ آپا صالحہ نے اپنی ساس کو دودھ کا گلاس پکڑاتے ہوئے دانستہ لاپرواہی سے پوچھا۔ اتنا تو انہیں بھی پتا تھا کہ وہ ڈراموں کی خاصی شوقین تھیں۔

کے ہونٹوں کے بائیں طرف موجود چھوٹا سا تِل اور وہی روشن چمکدار آنکھیں جن کا نقش ان کے دل پر کھدا ہوا تھا۔ وہ بے تاب انداز میں ٹی وی کی جانب بڑھیں، جیسے ہاتھ بڑھا کر اسے باہر نکال لیں گی، لیکن چند سیکنڈ کا اشتہار ختم ہو چکا تھا۔ وہ مایوس ہو کر وہیں بیٹھ گئیں اور ٹی وی کی آواز بند کر کے وہ پوری دل جمعی سے اشتہارات دیکھنے لگیں۔ ان کا دل اتنے زوردار طریقے سے دھڑک رہا تھا جیسے پسلیوں کو توڑ کر باہر نکل آئے گا۔

”صالحہ پتر! نیند نہیں آرہی کیا۔۔۔؟“ بے بے کی آواز پر وہ بری طرح اچھلیں۔
 ”آپ جاگ رہیں نہیں کیا؟“
 وہ اچھی خاصی شرمندہ ہو گئیں۔

”نہیں۔۔۔ ٹی وی کی آواز بند ہونے سے آنکھ کھلی ہے میری۔۔۔“ وہ معصومیت سے گویا ہوئیں۔
 ”آپ بھی دنیا کی پہلی اور آخری خاتون ہوں گی، جن کی نیند شور سے نہیں بلکہ خاموشی سے خراب ہوتی ہے۔“ انہوں نے ہلکے پھلکے انداز میں اپنی ساس کو چھیڑا تو وہ مسکرا دیں۔ جب کہ صالحہ کی نگاہیں ابھی تک ٹی وی پر جمی ہوئی تھیں، لیکن بسکٹ کا وہ اشتہار آنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ تنگ آکر انہوں نے ٹی وی بند کر دیا اور اپنے کمرے میں چلی آئیں۔ یہ رات بھی گزشتہ راتوں کی طرح انہوں نے کانٹوں پر ہی گزاری تھی۔

”آخر کون تھی وہ لڑکی اور میرا دھیان بار بار ایک ہی طرف کیوں جا رہا ہے۔“ انہوں نے اپنے اندر بڑھتے ہوئے گھٹن کے احساس کو کم کرنے کے لیے کمرے کی کھڑکی کھولی اور لمبے لمبے سانس لینا شروع کر دیے۔

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے میرا اندازہ غلط ہو۔“ انہوں نے خود کو تسلی دینے کی کوشش کی، لیکن دل ناداں اس بار سنبھلنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

”یا اللہ اسے اپنی حفظ و امان میں رکھنا۔“ انہوں نے ہمیشہ کی طرح اللہ سے رجوع کیا۔ نوافل پڑھنے

”کس چینل پر۔۔۔؟“ بے بے نے دودھ کا گلاس پکڑتے ہوئے انہیں تھیر میں مبتلا کیا۔

”آپ کو پتا تو ہے مجھے کہاں شوق ہے ان فلموں ڈراموں کا اور کیا پتا کون کون سے چینلز پر آتی ہیں ایسی چیزیں۔۔۔“ انہوں نے صاف گوئی سے کہا۔
 ”پھر کیوں پوچھ رہی ہو تم۔۔۔؟“ بے بے کا لہجہ تو عام سا تھا، لیکن وہ گھبرا گئیں۔

”میں تو ایسے ہی بات کر رہی تھی۔“ وہ اٹھ کر خواجواہ ان کے پلنگ پر پچھلی چادر کی نادیدہ سلوٹس دور کرنے لگیں۔

”آج کل دو نئے ڈرامے شروع ہوئے ہیں۔“ بے بے نے ان کی معلومات میں اضافہ کیا۔

”اچھا۔۔۔ کون کون سے۔۔۔؟“ وہ ان کے قریب آکر بیٹھ گئیں، جب کہ بے بے ان کو دونوں ڈراموں کی کہانی سناتے لگیں، جو انہیں بالکل سمجھ میں نہیں آتی، کیونکہ ان کی نظریں ٹی وی اسکرین پر جمی ہوئی تھیں جہاں وہ کسی خاص چہرے کی منتظر تھیں، جو اللہ جانے کہاں چھپ گیا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد ہی وہ بور ہو کر کھڑی ہو گئیں، عشاء کی نماز کا وقت ہو چکا تھا۔

”اب ڈراما تو پورا دیکھ لو۔۔۔“ بے بے نے انہیں دروازے کی طرف جاتے دیکھ کر ٹوکا۔

”میں نماز پڑھ کر آتی ہوں۔“ وہ جلدی سے کہہ کر کمرے سے نکل گئیں۔ عشاء کی نماز کے بعد وہ اپنی تسبیحات سے فارغ ہو کر بے بے کے کمرے میں آئیں تو ٹی وی چل رہا تھا، جب کہ وہ گہری نیند میں تھیں، یہ ان کی ہمیشہ سے عادت تھی کہ ٹی وی دیکھتے دیکھتے سو جاتیں اور پھر رات کے کسی پہر ان کی آنکھ کھلتی تو ریموٹ کنٹرول سے ٹی وی بند کر کے دوبارہ سو جاتیں۔

صالحہ نے ان کے سرہانے کے پاس رکھا ریموٹ اٹھایا اور جیسے ہی بند کرنے کے لیے ان کی انگلی ریموٹ کنٹرول کی طرف بڑھی انہیں زوردار جھٹکا لگا۔ سامنے ٹی وی پر بسکٹ کے اشتہار میں ہنستا مسکراتا چہرہ وہی تھا جو اس دن انہوں نے بل بورڈ پر دیکھا تھا۔ اس

کے بعد ان کا ذہن کچھ پرسکون ہوا تو وہ سو گئیں، لیکن دل ہی دل میں وہ تہیہ کر چکی تھیں کہ اس لڑکی کا کھوج لگا کر رہیں گی۔

اگلی صبح مدرسے کی بچیوں سے فراغت پا کر وہ کسی کام سے بے بے کے کمرے میں آئیں تو مونا وہاں بیٹھی چائے پی رہی تھی اور پی وی چل رہا تھا۔
”آپا! آئیں نا بہت زبردست ڈراما شروع ہوا ہے۔“ مونا نے بوکھلا کر انہیں پیش کش کی۔

”کون سا۔۔۔؟“ انہوں نے خلاف عادت پوچھا تو مونا ایک دم حیران ہوئی۔ جب کہ ان کی نظریں پی وی پر جمی ہوئی تھیں جہاں وہی معصوم چہرہ اپنی آب و تاب کے ساتھ موجود تھا۔

”مونا! اس لڑکی کا نام کیا ہے۔۔۔؟“ انہوں نے بے تابی سے پوچھا۔

”کس کا۔۔۔؟“ مونا نے چونک کر ان کی نظروں کے تعاقب میں پی وی اسکرین کی طرف دیکھا۔

”اوہ یہ تو شانزے ابراہیم ہے، پہلا سیریل ہے یہ اس کا۔۔۔“ مونا کی معلومات قابل رشک تھیں۔ جب کہ دوسری طرف آپا صالحہ جتنی دفعہ اسے دیکھ رہی تھیں اتنی ہی دفعہ ان کے دل کی دھڑکنوں کے ساتھ ایک ہی نام رقص کر رہا تھا جسے وہ سننا نہیں چاہتی تھیں۔



شانزے نے بمشکل رباب کو منایا تھا بس ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنے کی کسر رہ گئی تھی۔ رباب نے اگرچہ اپنا بیگ دوبارہ اسے الماری میں رکھ دیا، لیکن اس کے چہرے پر چھائی سنجیدگی کسی صورت بھی کم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

”اب اپنا موڈ تو ٹھیک کر لو تم۔۔۔“ وہ اس کے لیے کافی بنا کر ٹیس میں لے آئی۔

”موڈ میرا ٹھیک ہے، میں بس اس وقت سے ایک ہی بات سوچ رہی ہوں۔“ وہ بات کرتے کرتے رکی، شانزے نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”کچھ لوگ بہت بد قسمت ہوتے ہیں شانزے، انہیں رشتوں کی قدر اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک وہ انہیں کھونہ دیں۔“

”تم مجھ پر طنز کر رہی ہونا۔۔۔“ شانزے فوراً بات کی تہ تک پہنچی۔

”نہیں۔۔۔ تمہیں بتا رہی ہوں۔“ رباب نے سادگی سے کہا۔

”فکر مت کرو، میری زندگی میں ویسے ہی گئے پٹے لوگ ہیں اور تم واحد دوست ہو میری۔۔۔“ شانزے نے اطلاع دینے کے انداز میں اسے بتایا۔

”یہ ہی تو سب سے بڑی مصیبت ہے۔“ اس کے بڑبڑانے پر شانزے چونکی۔ ”کیسی مصیبت۔۔۔؟“

”پتا ہے جن لوگوں کا کوئی دوست نہیں ہوتا ان سے بہت زیادہ ڈر لگتا ہے مجھے۔۔۔“ وہ صاف گواہ انداز میں گویا ہوئی۔

”وہ کیوں بھلا۔۔۔؟“ شانزے کافی پینا بھول کر اس کا سنجیدہ چہرہ غور سے دیکھنے لگی۔

”جن کا کوئی دوست نہیں ہوتا، ان میں کوئی نہ کوئی ایسی ناپسندیدہ بات ہوتی ضرور ہے جو کوئی بھی ان کے قریب جانا پسند نہیں کرتا۔“ رباب کا لہجہ اس کا دل دکھا گیا۔

”تمہارا خیال ہے کہ میرا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔“ شانزے دکھی ہوئی۔

”میں چاہتی ہوں کہ تمہارا شمار ایسے لوگوں میں نہ ہو۔“ رباب کی بات پر اس کے دکھ کی شدت کم ہوئی۔

”پلیز۔۔۔ شانزے! لوگوں کی قدر کیا کرو، اچھے اور مخلص لوگ زندگی میں بار بار نہیں ملتے۔“ رباب کی بات پر وہ پھیکے سے انداز میں مسکرا دی۔

”ہاں۔۔۔ اسی لیے میں اس ویک اینڈ پر پھپھو کے پاس جا رہی ہوں۔“ شانزے کی بات نے اسے حیران کیا۔

”لاہور۔۔۔؟“ رباب نے تصدیق کے لیے پوچھا۔

”اس دفعہ جاؤ تو ان سے اپنی والدہ کے بارے میں ضرور پوچھنا۔“ رباب نے جلدی سے کہا۔

”ہاں بات کر کے دیکھوں گی شاید وہ لوگ ان کے بارے میں کچھ جانتے ہوں۔“ اس نے نیم رضامندی کا اظہار کیا۔

”شاید نہیں یقیناً“ وہ ان کے بارے میں کچھ نہ کچھ جانتے ہوں گے۔“ رباب نے اسے تسلی دی۔

”مجھے اب ماہیر کی بھی ٹینشن ہونے لگی ہے۔“ شانزے نے ہلکا سا جھجک کر کہا تو رباب نے حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھا وہ ایسی ہی تھی پل میں تولہ اور پل میں ماش۔

”کب آرہا ہے وہ پاکستان۔۔۔؟“ رباب نے اپنی معلومات میں اضافے کے لیے پوچھا۔

”پتا نہیں۔۔۔ وہ واقعی نہیں جانتی تھی۔“ ”ایسا کرو تم اسے خود فون کر کے بتادو ایسی باتیں جب تیسرے بندے کے منہ سے پتا چلیں تو زیادہ تکلیف دیتی ہیں۔“ رباب نے اسے خلوص دل سے مشورہ دیا۔

”اب تک تو سرمد بھائی انہیں بتا بھی چکے ہوں گے۔“ شانزے نے منہ بنا کر یاد دہانی کروائی۔

”نہیں۔۔۔ وہ ایسے نہیں ہیں میرا نہیں خیال کہ انہوں نے کچھ ماہیر کو بتایا ہوگا۔“ رباب نے فوراً ہی سرمد کی حمایت کی۔

”خیر ہے۔۔۔ تم آج کل بہت سرمد بھائی کا فیور کرنے لگی ہو۔“ شانزے کے چھیڑنے پر رباب کا چہرہ بلیش ہوا۔

”میں تو یونہی ایک جنرل سی بات کر رہی تھی۔“ اس نے گھبرا کر صفائی دی۔

”فکر مت کرو یہ جنرل سی باتیں ہی بعض دفعہ ”خاص“ بن جاتی ہیں انسان کو پتا ہی نہیں چلتا“ شانزے شرارت کے موڈ میں تھی۔ رباب نے ہنستے ہوئے اسے ایک جھانپڑ سید کیا۔ اگلے ہی لمحے دونوں

”آج تو یقین ہو گیا مجھے۔“ بڑی اماں نے اپنے بریف کیس سے کپڑے نکالتے ہوئے بوا رحمت کو مخاطب کیا۔ وہ اس وقت اپنا انگلیڈ سے واپس لایا ہوا سامان ٹھکانے لگانے میں مصروف تھیں۔

”کس بات کا بیگم صاحبہ۔۔۔؟“ بوا رحمت نے ان کے سوٹ کو سلیقے سے لٹکاتے ہوئے پوچھا۔

”یہ ہی کہ تمہارے صاحب کے سینے میں دل نہیں کوئی پتھر کی سلیب گڑی ہوئی ہے تب ہی تو کسی بات کا اثر نہیں ہوتا ان پر۔“ وہ حد درجہ خفا تھیں۔

”لیکن اب تو بہت فرق آچکا ہے ان میں۔۔۔“ بوا رحمت نے ان کی بات سے اختلاف کیا جو انہیں بالکل اچھا نہیں لگا۔

”کیسا فرق۔۔۔ اتنے سال بعد کوئی دشمن کا بچہ بھی سامنے آجائے تو انسان اس کا حال احوال پوچھ لیتا ہے۔ ادھر تو ہنوز ماتھے کے بل ہی کم ہونے کا نام نہیں لے رہے“ الٹا مجھے تو ان میں اضافہ ہی لگ رہا ہے۔“

انہوں نے غصے سے ہاتھ میں پکڑا دوپٹا مسہری پر پھینکا۔

”میں تیمور میاں کی نہیں اورید ابٹی کی بات کر رہی ہوں اب تو صاحب بہت خیال رکھنے لگے ہیں اس کا۔“ بوا نے گھبرا کر وضاحت دی۔

”تو یہ بھی سوچو نا اورید اکو پاکستان آئے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا۔ پورے پانچ سال۔۔۔“ انہوں نے باقاعدہ انگلیوں پر گن کر بتایا۔

”اچھا۔۔۔ آپ ٹینشن نہ لیں، ٹھیک ہو جائیں گے وہ۔“ بوا رحمت الماری میں کپڑے جمانے لگیں۔

”کتنا دل خراب ہوا ہوگا میرے بچے کا۔“ ان کی سوئی ابھی تک وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

”تو تیمور میاں کو کون سا نہیں پتا تھا یاد نہیں، کتنی کھری کھری سنائی تھیں“ انہوں نے اسے فون کر کے۔“ بوا رحمت نے ماضی کی ایک تلخ یاد کی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ☆ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

طرف اشارہ کیا۔

”وہ قیامت خیز گھڑیاں کیسے بھول سکتی ہوں میں۔“ انہوں نے ایک سرود آہ بھری۔

”جب وہ وقت گزر گیا تو یہ بھی گزر جائے گا۔ تھوڑا حوصلے سے کام لیں۔“ بوا نے انہیں حوصلہ دیا۔

”ویسے طبیعت ٹھیک تھی تمہارے صاحب کی جو بھتیجی کے ہاں فنکشن میں نہیں گئے۔“ انہیں اچانک یاد آیا۔

”یہ معمہ تو میری بھی سمجھ سے باہر ہے تب سے منہ پھلائے گھوم رہی ہے بینش۔“ بوا رحمت الماری بند کرتے ہوئے مسکرائیں۔

”لیکن یہ معجزہ ہوا کیسے۔؟“ بڑی اماں کا موڈ بھی کچھ بہتر ہوا۔

”یہ تو اب بڑے صاحب جانتے ہیں یا بینش بیگم، اوپر سے ارصم نے بھی ادھر آنا بالکل ہی چھوڑ دیا ہے۔“ انہوں نے مزید ان کی معلومات میں اضافہ کیا۔

”ہاں نا دون ہو گئے ہمیں آئے ہوئے آغا کے علاوہ کسی نے جھانک کر بھی نہیں دیکھا ادھر۔“ انہوں نے بھی منہ بنایا۔

”بینش تو سنا ہے لاہور گئی ہوئی ہے اپنے مہمانوں کو چھوڑنے۔“ بوا نے لقمہ دیا۔

”ویسے کچھ زیادہ ہی لمبا عرصہ نہیں رہ گئی اس کی نند یہاں۔“ بڑی اماں کو حیرانی ہوئی۔

”ظاہر ہے بیٹے کی شادی کرنی تھی اور اپنی پرکٹی کبوتری بیٹی کو بھی زبردستی باندھ دیا ارصم کے ساتھ۔“ بوا رحمت کو غصہ آیا۔

”ہاں! ارصم والے قہے کا تو مجھے بھی دکھ ہے یہ زیادتی نہیں کرنی چاہیے تھی بینش کو۔ اس کے نانا بتا رہے تھے بالکل خوش نہیں ہے وہ۔“ بڑی اماں کا یہ جملہ کمرے میں داخل ہوئیں اوریدا اور عدینہ دونوں نے سنا تھا۔

”کون خوش نہیں ہے بڑی اماں؟“ اوریدانے یوں ہی پوچھا۔

”ارصم۔!“ انہوں نے پھر ایک سرود آہ کھینچی۔

”کیوں۔ کیا ہوا ہے اسے۔؟“ اوریدا کا دل بے ربط انداز میں دھڑکا۔

”پوچھ تو تم ایسے رہی ہو جیسے تمہیں کسی بات کی خبر ہی نہ ہو۔؟“ بڑی اماں نے ہلکی سی بے زاری سے اسے ٹوکا۔ عدینہ کو ہنسی آگئی۔

”کیا بات کر رہی ہیں؟ مجھے واقعی کچھ نہیں پتا۔“ وہ جھنجلا گئی۔

”کیوں ارصم نے تمہیں نہیں بتایا کہ اس کی ماں نے زبردستی اسے اس کی پھپھی کی بیٹی سے باندھ دیا ہے؟“ وہ منہ بنا کر بولیں۔

”اب اتنا بھی بچہ نہیں ہے وہ کہ کوئی بھی انگلی سے پکڑ کر اسے جس مرضی کھونٹے سے باندھ دے۔“ اوریدا کے بولنے سے پہلے ہی بوا رحمت نے بے تکلفی سے تبصرہ کیا۔ اوریدا چپ کی چپ رہ گئی۔ عدینہ کو اس پر رحم آیا۔

”تمہیں بینش کی مکاریوں کا اندازہ نہیں ہے بوا، ایسا جال بچھاتی ہے کہ بندہ کہیں پر نہیں مار سکتا۔“ بڑی اماں نے تو لگتا تھا بینش پر پی ایچ ڈی کر رکھا تھا۔

”اماں! آپ چھوڑیں ان باتوں کو۔“ اوریدا کے صبر کا پیمانہ چھلکا۔

”تمہیں کیا ہوا ہے؟ ایسے کیوں منہ بنا رہی ہو؟“ انہوں نے غور سے اس کی شکل دیکھی۔

”یہ عدینہ واپس جا رہی ہے ہاسٹل، آپ اسے منع کریں نا۔“ اوریدا کو یاد آیا کہ وہ بڑی اماں کے پاس کس کام سے آئی تھی۔

”کیوں بھئی لڑکی ہماری آمد کیا اتنی بری لگی ہے کہ تم نے اپنا سامان باندھ لیا۔“ ان کے دو ٹوک انداز پر عدینہ گڑبڑائی۔

”نن نہیں! بڑی اماں ایسی تو کوئی بات نہیں۔“

”تو پھر سامان کھولو اپنا، کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔“ بڑی اماں کے لہجے اور انداز میں ایسا کچھ تھا

کہ عدینہ بوکھلا گئی۔ جبکہ اوریدا نے بڑے مزے سے اس کی بوکھلاہٹ سے لطف اٹھایا۔

”وہ تو میں اس لیے کہہ رہی تھی بڑی اماں۔ اب آپ لوگ آجو گئے ہیں۔“ عدینہ کی بات پر بڑی اماں نے پاس رکھا اپنا چشمہ اٹھا کر آنکھوں پر لگایا اور اسے گھور کر دیکھا، وہ مزید گر بڑا گئی۔

”بیٹا! اگر ہمارا آنا اچھا نہیں لگا تو ہم واپس چلے جاتے ہیں۔“ ان کا انداز ہلکا پھلکا تھا، لیکن عدینہ کو گھبراہٹ میں مبتلا کر رہا تھا۔

”میرا یہ مطلب نہیں تھا بڑی اماں۔“ وہ ٹھیک ٹھاک پریشان ہوئی۔

”جو بھی مطلب تھا اپنا سامان کھولو، کچھ دن بعد چلی جانا، ابھی تو میری تم سے ڈھنگ سے ملاقات تک نہیں ہو پائی۔“ اس دفعہ انہوں نے محبت بھرے انداز میں کہا تھا، تب ہی عدینہ کے حلق سے ایک پرسکون سانس خارج ہوئی۔

”میں نے کہا تھا بڑی اماں جانے نہیں دیں گی، لیکن تم نے خواہ مخواہ کی ضد لگا رکھی تھی۔“ وہ اوریدا کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آئی۔

”قسم سے تمہاری بڑی اماں تو بالکل میری آپا کی طرح ڈانٹتی ہیں۔“ عدینہ کو ان کا انداز ابھن میں مبتلا کر رہا تھا۔ کوئی بات تھی ایسی جو اس کی سمجھ سے باہر تھی، وہ جب بھی بڑی اماں کی طرف دیکھتی تو ان کا انداز اسے خاصا مانوس اور آشنا سا محسوس ہوتا۔

”تم اپنی امی کو آپا کیوں کہتی ہو؟“ اوریدا کی حیرانی پر وہ مسکرائی، کیونکہ یہ سوال اکثر ہی اس سے کیا جاتا تھا۔ ”اصل میں امی کے مدرسے کی سناری بچیاں ان کو آپا کہتی تھیں تو میں نے بھی بچپن میں ان کی دیکھا دیکھی انہیں آپا کہنا شروع کر دیا۔“ وہ اوریدا کے ساتھ لان کی طرف نکل آئی تھی۔

”تو انہوں نے کبھی تمہیں ٹوکا نہیں۔؟“ اوریدا حیران ہوئی۔

”شروع شروع میں تو بہت کہتی تھیں، لیکن میری زبان پر امی کا لفظ چڑھتا ہی نہیں تھا، تنگ آکر انہوں

نے مجھے میرے جال پر چھوڑ دیا۔“ عدینہ بڑے مزے سے اسے بتا رہی تھی۔ دونوں جیسے ہی لان میں پہنچیں، اپنے پورشن سے باہر نکلتا ارصم انہیں دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

”ہائے ارصم! کیسے ہو؟ گیٹ چلے گئے تمہارے؟“ عدینہ نے اس کی طرف دیکھ کر دوستانہ انداز میں ہاتھ ہلایا۔ وہ ان کے قریب پہنچ گیا۔ اوریدا دانستہ ٹھٹکتے ہوئے گل چین کے پودے کے پاس آکر رک گئی۔

وہ ارصم کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ گل چین کے سفید اور سرخی نما پھولوں پر ایک تتلی بیٹھی ہوئی تھی۔ اوریدا کی نگاہیں تتلی پر اور سماعتیں ارصم اور عدینہ کی گفتگو پر تھیں۔

”ہاں۔ گیٹ چلے گئے تھے تم سناؤ، کیا ہو رہا ہے آج کل؟“ وہ بظاہر عدینہ سے بات کر رہا تھا، لیکن اس کی افسردہ نگاہیں اوریدا کی پشت پر جمی ہوئی تھیں جو اس کی جانب رخ موڑے ناراض سے انداز میں کھڑی تھی۔

”کچھ نہیں، بس ایگزام ہونے والے ہیں اور سخت ٹینشن ہو رہی ہے مجھے۔“ عدینہ نے مسکرا کر اطلاع دی۔

”تم جیسی جینٹلس لڑکی کو بھی ٹینشن ہوتی ہے تو باقی لوگوں کا کیا حال ہوگا۔“ اس کا لہجہ اوریدا کو کچھ جتا تا ہوا محسوس ہوا۔

”باقی لوگوں کے گھر میں چار چار ڈاکٹرز موجود ہیں، انہیں ٹینشن لینے کی کیا ضرورت ہے۔“ عدینہ فوراً ہی اس کا اشارہ سمجھی۔

”کسی ایملپ کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔“ ارصم نے کھلے دل سے پیش کش کی۔ ”فی الحال تو بڑے ابا ہی کافی ہیں۔ اس کے بعد دیکھیں گے۔“ اس نے لا پرواہی سے کندھے اچکائے۔

”عدینہ! میں پیلا کے پاس جا رہی ہوں تم فارغ ہو کر وہیں آ جانا۔“ اوریدا پٹی اور اپنی بات مکمل کر کے اندر کی جانب بڑھ گئی۔



”پاپا۔۔۔ آپ کوئی ٹینشن لے رہے ہیں کیا؟“ ماہیر نے تیمور صاحب کا بلڈ پریشر چیک کرتے ہوئے فکر مندی سے پوچھا۔ اتنا تو وہ بھی جانتا تھا کہ وہ اپنے والد کے رویے کی وجہ سے خاصے تناؤ کا شکار تھے۔

”کیوں میاں، کیا فشار خون بلند ہو رہا ہے میرا۔۔۔“ وہ مسکرا کر اپنے دونوں بچوں کی پریشان شکلیں دیکھنے لگے۔ اوریدا ان کے ساتھ جڑ کر بیٹھی ہوئی ان کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔

”اے اے، تو بھی ہوا تو نہیں، لیکن اسی طرح ٹینشن لیتے رہے تو ضرور ہو جائے گا۔“ ماہیر نے ہلکے پھلکے لہجے میں انہیں ڈرایا۔

”جس باپ کی اتنی اچھی۔۔۔ لائق اور فرماں بردار اولاد ہو، وہ بھلا کیوں ٹینشن لے گا۔“ انہوں نے مسکرا کر اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

”اب لائق اور فرماں بردار تو سمجھ میں آتا ہے کہ آپ نے ”میرے“ لیے کہا ہے، اس کا مطلب ہے کہ آپ اوریدا سے مطمئن نہیں۔“ ماہیر نے بالکل خاموش بیٹھی اوریدا کو چھیڑا جو اس وقت کچھ افسردہ سی لگ رہی تھی۔ ماہیر کی شرارت پر اس نے گھور کر اپنے بھائی کو دیکھا۔

”میری بیٹی تو بہت بدل گئی ہے، ماہیر۔۔۔“ تیمور نے بے ساختہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بوسہ لیا تو اوریدا کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

”آپ کو پتا ہے پاپا۔۔۔ میں آپ کو بہت مس کرتی تھی۔“ وہ جذباتی ہوئی۔

”فار گاڈ سیک اوریدا، یہاں کوئی رونے دھونے والا سین مت کرنا، میرا دلا سادینے کا کوئی موڈ نہیں۔“ ماہیر نے انگلی اٹھا کر شرارتی انداز میں تنبیہ کی تو اوریدا نے بھی ممکن آنسوؤں کا ایک گولہ زبردستی اپنے اندر دھکیلا۔

”مجھے کیا ضرورت ہے رونے کی۔۔۔ ہونہ۔۔۔“ وہ

”پاپا۔۔۔“ ارصم نے تعجب انگیز نگاہوں سے عدینہ کی طرف دیکھا۔ ”یہ کس کی بات کر رہی تھی؟“

”اپنے فادر کی۔۔۔ اور کے پاپا کہہ سکتی ہے وہ۔۔۔“ اب کے حیران ہونے کی باری عدینہ کی تھی۔

”انکل تیمور۔۔۔“ ارصم کو جھٹکا لگا۔ ”انکل تیمور پاکستان آئے ہوئے ہیں کیا۔۔۔؟“

”کیا مطلب؟ آپ کو نہیں پتا کیا؟“ عدینہ نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ جیسے یقین نہ آیا ہو۔

”نہیں تو۔۔۔ میں تو کچھ دیر پہلے ہی ماما کے ساتھ لاہور سے واپس آیا ہوں، اصل میں میری پھپھو واپس جا رہی تھیں نا۔ ان کی لاہور سے فلائٹ تھی۔“ ارصم نے اس دفعہ ذرا تفصیل سے بتایا۔

”اوہ اچھا۔۔۔“ اسے ساری بات سمجھ میں آگئی۔

”پھر تو آپ کو یہ بھی نہیں پتا ہو گا کہ ماہیر اور بڑی اماں بھی واپس آچکے ہیں۔“ عدینہ نے اسے مزید حیران کیا۔

”نہیں۔۔۔“ اس نے شرمندگی سے نفی میں سر ہلایا۔ ”کب پہنچے سب لوگ۔۔۔؟“

”پرسوں دوپہر میں۔۔۔ میں بھی حیران تھی کہ آپ ملنے کیوں نہیں آئے۔“ عدینہ مزے سے بولی۔

”انکل تیمور کیسے ہیں اب۔۔۔؟“ ارصم نے جلدی سے پوچھا۔

”یہ سامنے ہی تو ان کا پورشن ہے، آپ جا کر پوچھ لیں، انہیں خوشی ہوگی۔“ عدینہ کے خوش گوار لہجے پر وہ پھیکے سے انداز میں مسکرا دیا۔

”میں، ماما اور آغا جی کو بتا کر آتا ہوں۔“ وہ اس کے ساتھ ہی چل پڑا۔

”اے ارصم بھائی کب بڑے ہوں گے آپ بس کرویں اب، سارے فیصلے ماما کے پلو کو پکڑ کر ہی کرنے ہوتے ہیں کیا؟“ عدینہ کا طنزیہ انداز اسے کوفت میں مبتلا کر گیا۔ وہ جان گیا تھا کہ وہ کس تناظر میں یہ بات کر رہی ہے۔

”میں تو ویسے ہی کہہ رہا تھا، چلو انکل۔۔۔ تیمور سے مل کر آتے ہیں۔“ وہ شرمندگی سے سر جھکا کر اس کے

محبت بھرے انداز میں اس نوجوان لڑکے کو دیکھا، وہ بالکل اپنے باپ کی طرح تھا۔ طیبہ نے بینش کی شادی کی تصویریں انہیں ای میل کی تھیں۔

”اور سناؤ، آغا جی کیسے ہیں؟“

”وہ ٹھیک ہیں، انہیں شاید آپ کی آمد کا علم نہیں ہے۔“ ار صم نے کچھ جھجک کر جواب دیا۔

”ایسی کوئی بات نہیں بر خوردار وہ مجھ سے مل کر گئے ہیں کل۔“ تیمور نے اسے حیران کیا۔

”اچھا۔۔۔“ ار صم نے تعجب سے ان کی جانب ایسے دیکھا جیسے اس بات کا یقین نہ آیا ہو۔

”اور سناؤ ار صم، تمہاری نالائق اسٹوڈنٹ کی اسٹڈیز کیسی جارہی ہیں۔“ ماہیر نے بھی مسکرا کر گفتگو میں حصہ لیا۔

”آپ شاید اوریدا کی بات کر رہے ہیں۔“ وہ ہلکا سا جھجک کر بولا۔

”کیا کوئی اور بھی نالائق کزن آگئی ہے تمہاری اس گھر میں۔۔۔؟“ ماہیر نے اس دفعہ ذرا غور سے اس کا الجھن بھرا چہرہ دیکھا۔ وہ اسے کچھ پریشان لگا تھا۔ جیسے اس موضوع پر بات کرنا نہ چاہ رہا ہو۔

”میں بڑے ابا سے پڑھتی ہوں اب۔۔۔“ اوریدا سنجیدگی سے بولتی ہوئی ماہیر اور تیمور کو خوش گوار حیرت میں مبتلا کر گئی۔

”بڑے ابا سے۔۔۔؟“ ماہیر کو یقین نہیں آیا۔

”یقین نہیں آتا تو عدینہ سے پوچھ لیں، یہ بھی تو بڑے ابا کی بڑی چھٹی اسٹوڈنٹ ہے۔“ اوریدانے فوراً ہی خاموش بیٹھی عدینہ کو معاملے میں کھیٹا۔

”عدینہ کو تو خیر کسی ٹیوٹر کی ضرورت ہی نہیں، اس سے پتا چل گیا کہ تم جھوٹ بول رہی ہو۔“ ماہیر جب سے آیا تھا اسے مسلسل تنگ کر رہا تھا۔

”پاپا دیکھ لیں انہیں۔۔۔“ اوریدا مصنوعی ناراضی سے بولی۔

”اے تو میں دیکھتا ہی رہتا ہوں بیٹا، ابھی آپ جاکر میرے اور ار صم کے لیے اچھی سی چائے بنا کر لائیں۔“ تیمور نے محبت سے اسے اٹھایا۔

اچھی خاصی چڑ گئی تھی۔

”پاپا۔۔۔ میں نے آپ سے کچھ پوچھا ہے؟“ ماہیر نے اپنا — سوال پھر دہرایا۔

”بھئی میں کیوں نہیں ہوں گا بھلا۔۔۔؟“ تیمور صاحب نے الٹا اس سے سوال پوچھا۔

”وہ۔۔۔“ وہ تھوڑا سا اٹکا۔ ”بڑے ابا جو آپ سے بات نہیں کر رہے اس لیے پوچھ رہا ہوں۔“

”بھئی کر لیں گے، ابھی مجھے آئے ہوئے ٹائم ہی کتنا ہوا ہے۔“ انہوں نے مسکرا کر اسے دلاسا دیا۔

”بڑے ابا کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔“ اوریدانے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

”وہ خفا ہیں مجھ سے اور سچ پوچھو تو یہ ناراضی ان کا حق بنتی ہے۔“ وہ اداس ہوئے۔

”بچوں سے غلطیاں تو ہو ہی جاتی ہیں۔“ اوریدا نے جھٹ۔۔۔ کہا۔

”کچھ غلطیاں ناقابل معافی ہوتی ہیں۔ انسان چاہے بھی تو اپنا ظرف بڑا نہیں کر سکتا۔“ وہ لاشعوری طور پر اپنے باپ کی حمایت کر رہے تھے۔ اسی دوران کھلے دروازے سے عدینہ اور ار صم داخل ہوئے۔ تیمور نے خوش گوار حیرت سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔

”السلام علیکم انکل! کیسے ہیں آپ۔۔۔؟“ ار صم بڑے پرجوش انداز میں ان کی طرف بڑھا، اوریدانے سہارا دے کر تیمور کو بیٹھنے میں مدد دی۔

”آپ ڈاکٹر ار صم ہیں نا؟“ تیمور نے مسکرا کر بالکل درست انداز لگایا۔ اوریدا مختلف فنکشنز کی تصویریں اکثر انہیں واٹس ایپ کرتی رہتی تھی اور ایک دودھ ان کی ار صم سے فون پر بھی پات ہوئی تھی، لیکن اس طرح رو برو ملاقات کا یہ پہلا موقع تھا۔

ار صم کو پہلی نظر میں تیمور انکل کی شخصیت بڑی متاثر کن لگی تھی۔ وہ بے تکلفانہ انداز میں اس کا حال احوال پوچھ رہے تھے۔

”اوریدا اسے اکثر ذکر سنا تھا تمہارا۔۔۔“ تیمور کی بات پر اوریدانے بے چینی سے پہلو بدلا اور ار صم کے چہرے پر ایک پھینکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ تیمور نے

بھول گئے آپ لوگ۔۔۔“ وہ متفر لہجے میں انہیں یاد دلا رہی تھیں۔

”شادی ہی تو کی تھی نا اس نے؟ ایسا کون سا غلط کام کر لیا۔“ آغا جی کا ساہ لہجہ ان کے دل میں آگ لگا گیا۔

”بہت افسوس کی بات ہے آغا جی، اگر آپ کے نزدیک یہ ایک معمولی بات ہے۔ اس ایک بات نے میری ساری زندگی کا سکون غارت کر دیا، کیا کمی تھی آپ کی بیٹی میں۔ بولیں، جواب دیں۔۔۔“ وہ آج پہلی دفعہ اس موضوع پر ان کے رویہ آئی تھیں۔

”بات کمی کی نہیں بیٹا۔۔۔“ انہوں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

”تو پھر کس چیز کی ہے؟“ بینش نے فوراً ان کی بات کو کاٹا۔

”یہ تو قسمتوں کے فیصلے ہوتے ہیں، تمہاری قسمت میں جاوید کا ساتھ تھا تو کوئی اور شخص کسے آسکتا تھا تمہاری زندگی میں۔۔۔؟“ انہوں نے سنجیدگی سے اس کا سخت ناراض چہرہ دیکھا۔

”اس دو ٹوکے کی لڑکی کی خاطر۔۔۔ اس نے ایک بڑھی لکھی، قابل ڈاکٹر کو ٹھکرا دیا، یہ قسمت کا فیصلہ نہیں، آپ کی اور میری بے وقوفی تھی، جو اس منشی کی تھرڈ کلاس بیٹی کو اپنے گھر میں لے آئے منہ اٹھا کر۔۔۔“ وہ غصے سے اب باقاعدہ ٹھکنے لگیں۔

”وہ مرچکی ہے بینش۔“ آغا جی نے انہیں یاد دلانے کی کوشش کی۔

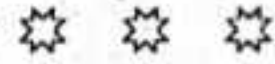
”تو۔۔۔“ وہ خفگی سے بھرپور نظروں سے انہیں دیکھنے لگیں۔

”مرے ہوئے انسان کے لیے ایسے لفظوں کا استعمال مت کرو۔“ انہوں نے نرمی سے ٹوکا۔

”وہ تو مر کر جان چھڑا گئی اس دنیا سے، آپ مجھے بتائیں، میں کیا کروں؟ میں تو روز جیتی ہوں اور روز مرتی ہوں، اپنی توہین کا احساس مجھے ہر وقت چر کے لگاتا ہے۔ آخر کیوں کیا تیمور نے میرے ساتھ ایسا۔۔۔؟“ وہ ایک دم چیخیں۔

”تیمور کی زندگی میں اسی نے آنا تھا۔ تم اپنے آپ

”ارصم چائے نہیں بلیک کافی پیتا ہے۔“ اورید کی زبان پھسلی اور وہ بوکھلا کر کھڑی ہو گئی۔ عدینہ اور اارصم نے چونک کر اس کا خفت زدہ چہرہ دیکھا۔ وہ جلدی جلدی اپنی چپل پہن رہی تھی جیسے اڑ کر اس کمرے سے نکل جانا چاہتی ہو۔ جبکہ اارصم ان سے بے نیاز ٹمکنی باندھے اسے دیکھے جا رہا تھا جیسے اسے یقین نہ آیا ہو کہ یہ جملہ اورید کے منہ سے نکلا ہے۔



”تیمور، پاکستان آگیا ہے؟“ حیرت، غصے اور صدمے کی زیادتی سے بینش کا منہ کھلا اور بند ہونا بھول گیا۔

”ہاں۔۔۔“ آغا جی نے نظریں چرا کر اپنی بات کی تصدیق کی۔

”واٹ۔۔۔؟“ ناگواری کی ایک تیز لہر ان کے پورے وجود میں بجلی کی طرح دوڑی، ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کوئی لاوا ایک دم ہی ان کے وجود کے اندر پھوٹا ہو۔ انہوں نے اس طرح آغا جی کی طرف دیکھا جیسے ابھی تک ان کی بات کا یقین نہ آ رہا ہو۔

”اس میں اتنی حیرانی والی کیا بات ہے؟“ آغا جی کی گود میں ایک ہیلتھ جرنل کھلا پڑا تھا۔ وہ ہاتھ میں چائے کا کپ لیے بالکل عام سے انداز میں اپنی بیٹی کی طرف دیکھ رہے تھے جس کا چہرہ دھواں دھواں اور آنکھوں میں تنفر کے۔۔۔ بد نما رنگ ایک دم ہی ابھرے تھے۔

”نایا ابانے اسے گھنے بھی کیسے دیا گھر میں۔۔۔؟“ انہوں نے اپنے ہاتھ میں پکڑے کپ کو باقاعدہ میز پر پٹا تھا۔ تھوڑی سی چائے چھلک کر میز کے سیاہ شیشے پر پھیل گئی۔ آغا جی نے ناگواری سے ان کی اس حرکت کو دیکھا۔

”یہ گھر تیمور کے نام ہے، یہاں آنے سے کون روک سکتا ہے اسے۔“ آغا جی کی بات پر بینش نے خود کو بمشکل بھڑکنے سے روکا۔

”کتنی گھٹیا حرکت کر کے گیا تھا وہ یہاں سے؟ کیا یہ

”میں! آپ ایسے کیوں بات کر رہی ہیں، میں نے کیا کیا ہے؟“ اس نے خلاف توقع احتجاج کیا۔
”کیا ضرورت تھی ان کی طرف جانے کی؟“ وہ تلخ لہجے میں بولیں۔

”کیوں نہیں جانا چاہیے تھا آخر؟ مجھے بھی تو پتا چلے۔“ اس کے ضبط کا پیمانہ بھی چھلکا۔

”اب تم مجھ سے سوال جواب کرو گے؟“ وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر اس کے سامنے آن کھڑی ہوئیں۔ اس سے پہلے کہ ارصم ان کی بات کا جواب دیتا، آغا جی نے فوراً ”بات بدلنے کی کوشش کی۔“ ارصم بیٹا آپ نے ہاسٹل نہیں جانا کیا بہت ہرج ہو گیا ہے اسٹڈیز کا۔“

”کہیں نہیں جانا اس نے“ اسی گھر میں رہے گا۔“ بینش کے اعصاب بری طرح چٹختے۔

”اگر آپ اسی طرح کہیں کا غصہ کہیں اور نکالتی رہیں تو میں یہ گھر ہی کیا شہر بھی چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔“ ارصم بھی بھڑک کر بولا۔ وہ تو ویسے ہی پچھلے کچھ دنوں سے شدید ذہنی اذیت سے دوچار تھا اور اوپر سے بینش کی گئی زبردستی کی منگنی کا غم بھی ابھی تازہ تھا۔

”آپ نے دیکھا آغا جان، یہ کیسے دھمکیاں دے رہا ہے مجھے؟“ انہوں نے شکایتی نگاہوں سے آغا جی کی طرف دیکھا۔

”تم بھی تو ہر معاملے میں اسے خواجواہ گھسیٹ لیتی ہو۔“ آغا جی کا اپنا بھی مزاج آج برہم تھا۔

”ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔! اس گھر میں ایک میں ہی فساد کی جڑ ہوں، باقی سب تو دودھ کے دھلے ہوئے ہیں۔“ وہ اندرونی خلفشار کے تحت ناراضی سے گویا ہوئیں اور پاؤں پیختے ہوئے کمرے سے نکل گئیں۔ ارصم نے شکایتی نظروں سے آغا جی کی طرف دیکھا۔

”تم نے ضروری بی سی لندن کی طرح آکرنیوز بریک کرنا تھی۔“ آغا جی نے ارصم کی کلاس لی جو منہ بنائے کھڑا تھا۔

”تو مجھے کون سا پتا تھا وہ پرانے کھاتے کھول کر بیٹھی ہوئی ہیں۔“ ارصم نے بے زاری سے جواب دیتے ہوئے ارسلہ کی کال دوسری دفعہ کالی۔ وہ پچھلے دس

کو یہ بات سمجھا کیوں نہیں لیتی ہو۔“ آغا جی کو اپنی بیٹی پر ترس آیا۔ وہ اپنی لگائی ہوئی خود ساختہ حسد کی آگ میں بہت سالوں سے جل رہی تھیں۔ ارصم نے اندر داخل ہوتے ہوئے آغا جی کا یہ جملہ سنا تو ٹھنک کر اپنی جگہ کھڑا رہ گیا، وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بینش کی نفرت کے پیچھے چھپی اصل وجہ یہ ہوگی۔

”نہیں نکال سکتی میں آغا جی! آپ یہ بات مت کہا کریں مجھے۔“ وہ اس قدر زور سے چلا میں کہ نہ چاہتے ہوئے بھی ارصم کو کمرے میں داخل ہونا پڑا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ گھر کے ملازموں تک اس چیخ و پکار کے پیچھے چھپی ہوئی ”اصل“ وجہ پہنچے۔

”ماما! کیا ہو گیا ہے آپ کو۔۔۔ کیوں ایسے چلا رہی ہیں آپ؟“ ارصم ایک دم ان کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ بینش کا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ کچھ بھی تھا وہ اپنے ماضی کا یہ قصہ اپنی جوان اولاد کے سامنے نہیں کھول سکتی تھیں۔

”کچھ نہیں ہوا؟ تم کہاں گئے تھے؟“ وہ تھوڑا سا رخ موڑ کر اپنے آنسو صاف کرنے لگیں۔

”بڑے ابا کی طرف۔“ وہ لاپرواہی سے بولتا ہوا آغا جی کی طرف متوجہ ہوا۔ ”آغا جی! آپ بڑی اماں اور انکل تیمور سے مل کر بھی آگئے اور بتایا تک نہیں۔“ ارصم کی بات پر بینش نے تڑپ کر اپنے باپ کی طرف دیکھا جو نظریں چرائے بیٹھے تھے۔

”کیوں۔۔۔ تم نے کیا کرنا تھا؟“ وہ آہستہ سے گویا ہوئے۔

”میں اور می بھی مل آتے، وہ لوگ پرسوں سے آئے ہوئے ہیں۔“ ارصم نے روانی میں بینش کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

”کیوں۔۔۔؟ میں نے کیا اکیس توپوں کی سلامی دینی تھی انہیں یا ریڈ کارپٹ استقبال کرنا تھا۔“ وہ بولی نہیں پھنکاری تھیں۔ ”اور تم کس خوشی میں انہیں سلامیاں دینے پہنچ گئے تھے؟“ ارصم ہکا بکا انداز میں انہیں دیکھنے لگا، جو اکثر ہی اس کے ساتھ زیادتی کر جاتی تھیں۔

کپٹیوں کو سہارا ہے تھے۔ بینش کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔ آج کی رات بھی انہیں اکیلے ہی کڑھنا تھا۔



”اوریدا! تم نے نوٹ کیا ارصم کچھ ڈسٹرب سا تھا۔“ وہ اور عدینہ دونوں میڈیکل کی بھاری بھر کم کتابوں میں سر دیے بیٹھی تھیں۔ جب کہ اوریدا کی نگاہیں کتاب پر اور دھیان کہیں اور تھا۔ عدینہ نے کئی دفعہ اس کی بے توجہی کو محسوس کیا اور پھر بولے بغیر نہ رہ سکی۔

”پتا نہیں۔۔۔“ وہ صاف مکر گئی۔

”اب تم کم از کم میرے سامنے تو جھوٹ نہ بولو۔“ عدینہ کو غصہ آیا۔

”ٹرسٹ می میں نے اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔“ اس نے جھٹ سے صفائی دی۔

”جن سے محبت ہو، انہیں دل کی آنکھ سے دیکھا جاتا ہے اور اس کے لیے ظاہری بینائی کی ضرورت نہیں ہوتی۔“ عدینہ نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

”مجھے اس سے محبت ہے“ نہیں ”تھی۔۔۔“ اوریدانے فوراً تصحیح کی۔

”محبت کوئی نزلہ، زکام یا بخار تو نہیں، کبھی ہے اور کبھی نہیں۔“ اس نے برا سامنہ بنا کر مزید اضافہ کیا۔ ”تم اتنا زیادہ کونفیشن کیوں ہو جاتی ہو میرے سامنے۔؟“

”میں سچ کہہ رہی ہوں، ارصم کے لیے میرے دل میں اب کوئی گنجائش نہیں۔“ اوریدانے اس سے زیادہ خود کو یقین دلایا تھا۔

”زبان سے کہہ دینے سے دل اتنی جلدی مان جائے تو پیچھے رہ ہی کیا جاتا ہے۔“ عدینہ کو پتا تھا وہ جھوٹ بول رہی ہے۔

”تو تم کیوں پھر عبداللہ بھائی کے ساتھ ایسا کر رہی ہو؟“ اوریدانے بھی اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

”اس نے تو مجھے اس بات کی سزا دی، جس میں میرا

منٹ سے بار بار اسے فون کر رہی تھی، جب کہ وہ اس موقع پر اس سے بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔

”تمہیں ابھی تک اپنی ماں کے مزاج کا نہیں پتا چل سکا۔“ انہوں نے سنجیدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ان کا پتا تھوڑی چلتا ہے۔ کبھی دھوپ، کبھی چھاؤں۔۔۔“ اس نے بے زاری سے سائیڈ میز پر رکھے جگ سے گلاس میں پانی ڈالا اور پینے لگا۔ اس کا بلند ہوتا ہوا فشار خون آہستہ آہستہ نارمل ہونے لگا تھا۔

”بہر حال خیال رکھا کرو اپنی ماں کا۔۔۔“ آغا جی نے اسے نرم لہجے میں نصیحت کی۔

”اب آپ ہی بتادیں اور کتنا رکھوں؟ اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی سے تو دست بردار ہو گیا ان کے کہنے پر اب پیچھے رہ ہی کیا جاتا ہے۔“ وہ جھنجھلا گیا۔

کمرے میں دوبارہ داخل ہوتی بینش کو ارصم کی بات سن کر دھچکا سا لگا، وہ سیل فون ہاتھ میں لیے آرہی تھیں، دوسری طرف ارسلہ تھی جس نے ارصم کے بار بار کال کاٹنے پر تنگ آکر بینش کے نمبر پر فون کر دیا تھا۔

”ارسلہ کی کال ہے، وہ تم سے بات کرنا چاہ رہی ہے۔“ بینش نے خفگی سے کہتے ہوئے اپنا سیل فون اس کی جانب بڑھایا۔ اس نے بے زاری سے فون پکڑ کر کان سے لگایا اور ارسلہ کے بولنے سے پہلے ہی شروع ہو گیا۔

”میں تمہیں رات میں خود کال کر لوں گا۔ ابھی تھوڑا بڑی ہوں۔“ اس نے سرد لہجے میں کہہ کر فون بند کر دیا۔ بینش ہکا بکا سی رہ گئیں۔

”تم سے بات کرنا چاہ رہی تھی وہ۔۔۔“ انہوں نے جھنجھلا کر اپنے بیٹے کا بے زار چہرہ دیکھا۔

”سوری۔۔۔ میں اتنے خراب موڈ کے ساتھ کسی سے بات نہیں کر سکتا۔“ وہ ناراضی سے کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔

”آپ نے دیکھے اس کے تیور۔۔۔“ بینش نے چڑ کر اپنے باپ کی طرف دیکھا، جواٹکلیوں کی پوروں سے اپنی

ہوں۔“ اور ید ا جلدی سے اپنی الماری سے ایک پرانا اور بوسیدہ سا لکڑی کا ڈھال لائی۔
 ”ہاں ہاں دکھاؤ۔“ عدینہ پر جوش انداز میں اٹھ کر اس کے قریب آگئی۔

”ارے یہ انکل تیمور ہیں۔“ عدینہ پہلی تصویر دیکھ کر ہنسی، اس تصویر میں تیمور کی عمر کوئی چودہ پندرہ سال تھی اور وہ کسی درخت سے شرارتی انداز میں لٹکا ہوا تھا۔

”بابا۔۔۔ بہت جلدی تھے، طیبہ پھپھو اکثر ان کی شرارتوں کے قصے سناتی ہیں۔“ اور ید ا نے مسکرا کر بتایا۔

”یہ دیکھو طیبہ پھپھو کی سالگرہ کی تصویر۔“ اور ید ا نے ایک تصویر پر انگلی رکھی۔ جہاں ایک سات آٹھ سالہ لڑکی ہنستے ہوئے اپنی سالگرہ کا کیک کاٹ رہی تھی۔

”بہت مزے کی تصویریں ہیں۔“ عدینہ بڑے شوق سے پورا البم دیکھ رہی تھی۔

”اور یہ میری ڈیزنی پھپھو۔“ اور ید ا کے پر جوش انداز پر وہ ایک تصویر پر جھکی اور ساتھ ہی اسے زوردار کرنٹ لگا۔ اس نے خوف زدہ انداز سے دوبارہ اس تصویر کو دیکھا اور پھر سر اٹھا کر اور ید ا کا چہرہ غور سے دیکھنے لگی۔ پھپھی، بیٹی کے نقوش میں ممانکت کوئی ایسی انوکھی بات بھی نہیں تھی۔

”یہ تمہاری ڈیزنی پھپھو ہیں؟“ اس نے بے قابو ہوتی دھڑکنوں پر بمشکل قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں۔۔۔ بہت یگ اتج میں ان کی ڈتھ ہو گئی تھی۔“ اور ید ا کی بات نے اس کا رہا سا سکون بھی برباد کر دیا۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھے بے یقینی سے اس کی ڈیزنی پھپھو کی تصویریں دیکھے جا رہی تھی۔ اب تو اس میں ذرہ برابر بھی شبہ کی بات نہیں رہی تھی۔ عدینہ کے دل و دماغ میں ایک حشر پھا ہو گیا۔

”تمہیں کیا ہوا؟“ اور ید ا کو ایک دم ہی اس کی خاموشی کچھ پراسرار سی لگی۔

”کک کچھ نہیں۔“ وہ ہٹلائی۔

کوئی قصور ہی نہیں تھا۔“ عدینہ افسردہ ہوئی۔
 ”تو میرا کیا قصور تھا؟ میں نے ایک جائز رشتے کو ناپسندیدہ طریقے سے اپنانے سے انکار ہی تو کیا تھا۔“ اور ید ا کی آنکھیں نم ہوئیں۔

”کبھی کبھی میں سوچتی ہوں اور ید ا، محبت کے معاملے میں ہم لڑکیاں کتنی بے بس ہوتی ہیں۔“ اس نے گود میں رکھی کتاب بند کر کے کشن قالین پر رکھا اور مسہری سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئی۔

”وہ کیسے۔۔۔؟“ اور ید ا کو اس کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔

”دیکھو نا محبت کے سفر میں اگر کوئی لڑکی اپنے گھر والوں سے بغاوت کر کے محبوب کی انگلی تھام لے تو دنیا والوں کی انگلیاں اس پر اٹھ جاتی ہیں اور جب وہ اپنے خاندان اور ماں باپ کی عزت کا بھرم رکھ لے تو تب بھی بے وفائی کا طوق اس کے گلے میں پہنا دیا جاتا ہے۔“ عدینہ مزید تلخ ہوئی۔ ”اس لیے بتاؤ لڑکیاں بے چاریاں کریں تو کیا کریں آخر۔۔۔؟“

”انہیں چاہیے کہ وہ اپنے شرعی رشتوں کو غیر شرعی طریقوں سے مت ڈھونڈیں، اللہ نے کسی نہ کسی کا ساتھ تو لکھا ہی ہوتا ہے قسمت میں۔“ اور ید ا نے اپنے دل کو جب سے سمجھا لیا تھا تب سے کچھ پرسکون تھی۔

”کچھ بھی ہے ار صم کو تمہارے لیے اسٹینڈ لینا چاہیے تھا۔“ عدینہ کی سوئی ابھی تک وہیں انگی ہوئی تھی۔

”کیا فائدہ۔۔۔ مجھ جیسی لڑکیاں تو اسے ہزاروں مل سکتی ہیں، لیکن ماں کا رشتہ تو نہیں۔“ اور ید ا نے حقیقت پسندی کا مظاہرہ کیا۔

”ہاں یہ تو ٹھیک کہتی ہو تم، ماں کے رشتے کا تو کوئی بھی نعم البدل نہیں ہوتا۔“ عدینہ خلاف توقع فوراً ہی متفق ہوئی۔ ”تمہاری ماما کیسی تھیں اور ید ا۔۔۔؟“

”میری ماما۔۔۔“ اور ید ا کی آنکھوں میں ایک ساتھ کئی جگنو جمکے۔

”تم جیٹھو، میں تمہیں ان کی تصویریں دکھاتی

”تمہیں یقین ہے کہ تمہاری کچھپو کی ڈھتہ ہو چکی ہے؟“ وہ محتاط انداز میں گویا ہوئی۔

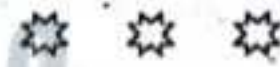
”ہاں نا۔۔۔ ہر سال ان کی برسی پر بڑی اماں باقاعدہ ختم دلواتی ہیں۔“ وہ لا پرواہی سے کہتے ہوئے چونکی۔

”لیکن تم یہ بات کیوں پوچھ رہی ہو؟“

”اے ہی مجھے یوں لگا جیسے ان خاتون کو میں نے کہیں دیکھا ہے۔“ اس نے جلدی سے بات بنائی۔

”ارے نہیں۔۔۔؟“ اور یہاں ہی۔۔۔ ”تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“

جبکہ عدینہ چاہتے ہوئے بھی اسے یہ نہیں بتا سکی کہ آج ہی تو کئی سالوں کی غلط فہمی دور ہوئی ہے۔ ایک دم ہی اس کا دل باقی تصویروں سے اچاٹ ہو گیا اور وہ اب بے دلی سے بس اور یہاں کی باتوں پر ہوں ہاں میں سر ہلا رہی تھی۔ جبکہ اس کا ذہن دور کہیں کسی اور گتھی کو سلجھانے میں لگا ہوا تھا۔



بختاور اس دن معمول سے زیادہ تھک گئی تھی۔ بجلی اور گیس کے بل ادا کرنے کی آخری تاریخ بھی اور اسے کافی دیر لائن میں لگ کر بل جمع کروانے پڑے تھے۔ واپسی پر وہ گھر کا سودا سلف لے کر گھر پہنچی تو سیڑھیوں پر ہاشم کے قمقمے کی آواز نے اسے حیران کیا۔

فلیٹ کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہی وی لاؤنج میں کسی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔

تین چار دن پہلے ہی اس کا پلستر کھلا تھا اور اب وہ چلنے لگا تھا۔

”لو تمہاری بھابھی بھی آگئیں۔۔۔“ وہ جیسے ہی اندر داخل ہوئی ہاشم کی پر جوش آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

”السلام علیکم۔۔۔“ تھوڑی سی جھجک کر وہ دروازے میں ہی رک گئی۔ ہاشم کے ساتھ اس ہی کی عمر کا ایک شخص موجود تھا۔ جس کے ساتھ بیٹھا ہوا وہ بے تکلفی سے پھل کھا رہا تھا۔ سینٹرل ٹیبل پر پھلوں کے بہت سے شاپر رکھے ہوئے تھے اور یہ پھل شاید نہیں یقیناً

وہ ہی شخص لایا تھا۔

”بختاور! یہ میرا بہت اچھا دوست ہے سیموئیل، کل ہی پاکستان آیا ہے۔“ ہاشم نے اسے دیکھتے ہی تعارف کی رسم نبھائی۔

”کیسے ہیں آپ۔۔۔؟“ بختاور کو پہلی نظر میں ہی یہ فریج کٹ واڑھی والا اس کا دوست اچھا نہیں لگا۔ مناسب قد کے ساتھ اس کی رنگت خاصی سپید تھی اور سر کے بال شاید اس نے ڈائی کر کے سنہری کر رکھے تھے اور اس کے چہرے پر موجود چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ایک محسوس کی جانے والی مکاری تھی۔

”فائن اینڈ“ آپ کیسی ہیں؟“ اپنی شخصیت کے برعکس اس کی آواز خاصی متاثر کن تھی۔

”تھیک ہوں“ چائے بناؤں آپ لوگوں کے لیے؟“

بختاور نے رسماً ”پوچھا۔

”نہیں“ میں سیموئیل کے ساتھ باہر کھانا کھانے جا رہا ہوں، تم بھی کھانا نہ بنانا کچھ بھی نہ بنانا بلکہ کچھ نہ کچھ لے آؤں گا۔ میں تمہارے لیے۔۔۔“ ہاشم کی بات پر اس کے حلق سے ایک پرسکون سانس خارج ہوئی، ویسے بھی وہ اس قدر تھکی ہوئی تھی کہ اس وقت ایک بستر کے علاوہ اسے کسی اور چیز کی طلب محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ہاشم اپنے دوست کے ساتھ شام۔ چار بجے کا گیارہ گیارہ بجے ڈھیروں سامان کے ساتھ لدا پھندا لوٹا تو بختاور کی آنکھوں سے ساری نیند بھک کر کے اڑ گئی۔

”یہ اتنا سامان کہاں سے آیا۔۔۔؟“ وہ ایک دم گھبرا گئی۔

”میں لے کر آیا ہوں اور کہاں سے آئے گا؟“ وہ لا پرواہی سے کہہ کر چیزیں شاپرز سے باہر نکالنے لگا۔

”لیکن پیسے کہاں سے آئے آپ کے پاس۔۔۔؟“ وہ پریشان ہوئی۔

”آسمان سے بارش ہوئی تھی، میں نے جلدی جلدی سمیٹ لی۔“ اس کا موڈ خاصا خوش گوار تھا۔

”ہاشم! میں آپ سے پوچھ رہی ہوں کہاں سے

لے کر آئے ہیں یہ سب۔۔۔ وہ فکر مندی سے جیم،
ڈبل روٹی، مکھن، چینی، شربت، کولڈ ڈرنکس، مسالے
اور ان ساری چیزوں کو دیکھ رہی تھی جنہیں وہ عیاشی
کے زمرے میں لا کر استعمال کرنا ترک کر چکی تھی۔

”فکر مت کرو، ڈاکا نہیں مارا میں نے کہیں پر۔۔۔“
وہ ایر فریشنر نکال کر اب کمرے میں اسپرے کرنے لگا،
ایک دم ہی پورا کمرہ جیسمن کی خوشبو سے مہکنے لگا۔
”لیکن پھر بھی کچھ پتا بھی تو چلے۔۔۔؟“ وہ اب ٹھیک
ٹھاک پریشان ہوئی۔

”سیموئیل نے کچھ عرصہ پہلے مجھ سے قرضہ لیا تھا،
وہ واپس کیا ہے آج۔۔۔“ اس نے ہنستے ہوئے انکشاف
کیا۔

”کیا ضرورت تھی اتنی فضول خرچی کرنے کی،
ہمیں تو آج کل ویسے ہی پیسوں کی اشد ضرورت
ہے۔“ بختاور اب فکر مند انداز سے دل ہی دل میں ان
تمام چیزوں کی قیمت کا اندازہ لگا رہی تھی۔

”فکر مت کرو ابھی بھی کافی پیسے ہیں میرے پاس
اور صبح دکاتوں کی مرمت کا کام بھی شروع ہو جائے
گا۔“ اس نے مزید اسے حیران کیا۔

”کیا لاکھوں کا قرضہ دے دیا تھا اسے۔۔۔؟“ بختاور کی
بات پر وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔

”نہیں جان من، میں اب سیموئیل کے ساتھ
پارٹنرشپ میں بزنس کر رہا ہوں۔“ اس نے مزے
سے ایک سوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ ”یہ دیکھو
میں تمہارے لیے لایا ہوں، کیسا ہے؟“ بختاور نے
ایک نظر اس خوب صورت لان کے سوٹ پر ڈالی،
موسم بدل چکا تھا اور اسے اب ان کپڑوں کی اشد
ضرورت تھی، لیکن ان سب چیزوں کو دیکھ کر اسے
خوشی کے بجائے گھبراہٹ کا احساس ہو رہا تھا۔

”ہوں۔۔۔ اچھا ہے۔۔۔“ اس نے ہاشم کا دل رکھنے
کے لیے زبردستی مسکرا کر کہا۔

”ویسے کیا بزنس شروع کر رہے ہیں آپ
لوگ۔“ بختاور سیموئیل کی طرف سے متفکر تھی۔

”نی الحال تو ایک پبلشنگ ادارہ لگائیں گے اور

سیموئیل امریکہ سے کچھ مہنگی بکس لا کر یہاں پاکستان
میں پبلش کرے گا، جن کی ادھر کافی مانگ ہوگی۔“
ہاشم اپنے بازوؤں کا تکیہ بنا کر بیڈ پر لیٹ گیا۔

”اس نے کیا وہاں سے پرمیشن لی ہے، میرا مطلب
ہے ان اشاعتی اداروں سے۔۔۔ کہیں کاپی ایکٹ کی
خلاف ورزی تو نہیں ہوگی۔“ بختاور کو ایک دم ہی کئی
خدشات لاحق ہوئے۔

”ظاہر ہے اس نے کچھ نہ کچھ تو انتظام کیا ہی ہو گا،
اب اتنا بھی بے وقوف نہیں ہے وہ۔۔۔“ ہاشم ہنسا۔

”پھر بھی آپ دیکھ بھال کر ہی پارٹنرشپ پیچھے گا۔“
اس نے فوراً ہی نصیحت کی۔

”بے وقوف لڑکی، ابھی تو سارا سرمایہ ہی وہ لگا رہا ہے
اور میں تو صرف اپنی خدمات دوں گا اسے، اس کام کے
لیے۔“ اس نے وضاحت دی۔

”سیموئیل کیا کر سچن ہے؟“ بختاور نے اس کے
نام سے اندازہ لگایا۔

”پہلے تھا، اب نہیں ہے۔“ دوسری طرف سے
فوراً ہی جواب آیا تو وہ کچھ مطمئن ہوئی۔

”اچھا تو اسلام قبول کرنے کے بعد کم از کم انسان
اپنا نام ہی تبدیل کرے۔“ وہ مطمئن ہو کر اب چیزیں
سمیٹنے لگی۔ جبکہ ہاشم نے اس کی اس بات کا کوئی جواب
نہیں دیا۔

”سنو بختاور اب تم جاب چھوڑ دینا۔“ اس کی بات
پر وہ مسکرائی۔ ”وہ کیوں۔۔۔؟“

”مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگتا تھا کہ تم جاب کرو،
مجھے بہت شرمندگی ہوئی تھی دل ہی دل میں۔۔۔“ پیسے
جیب میں آنے کے بعد ہاشم کا لہجہ ایک دم ہی تبدیل
ہو گیا۔ بختاور کو پہلی دفعہ احساس ہوا تھا کہ غرور واقعی
خوب صورت رشتوں کو بہت بد صورت بنا دیتی ہے۔

”ہاں دیکھوں گی، تھوڑا آپ کا کام سیٹ ہو جائے،
پھر ریزائن کر دوں گی۔“ وہ خود بھی جاب کرنا نہیں
چاہتی تھی۔ اس نے شاپر اٹھا کر الماری میں رکھنے

شروع کر دیے، ہاشم اسے غور سے دیکھتے ہوئے ایک
دم ہی چونکا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ☆ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



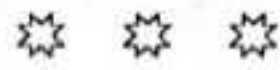
Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

”بختاور۔۔۔“ اس کے نرم لہجے پر وہ فوراً متوجہ ہوئی
 ”تم کسی ڈاکٹر کے پاس تو نہیں گئیں نا۔“ وہ اب
 شرمندہ لہجے میں اس سے پوچھ رہا تھا، بختاور فوراً سمجھ
 گئی کہ وہ کس معاملے کے بارے میں بات کر رہا ہے۔
 اس نے فوراً ہی نفی میں سر ہلایا تو وہ پرسکون ہو گیا۔
 ”کوئی ضرورت نہیں ہے اب جانے کی۔۔۔“ وہ
 نظریں چرائے بیٹھا تھا۔ بختاور کو ایک دم ہی اس پر پیار
 آیا۔ اسے احساس ہوا کہ وہ فطرتاً ایک برا انسان نہیں
 تھا لیکن حالات کے گرداب میں پھنس کر یہ سب
 کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس رات بہت عرصے کے
 بعد وہ دونوں ہی پرسکون نیند سوئے تھے۔



شائستہ بیگم اپنے دوپٹے پر تیل لگاتے ہوئے کن
 اکھیوں سے اپنے مجازی خدا کو دیکھ رہی تھیں جو
 مسلسل ایک ہی کتاب میں سردیے بیٹھے تھے۔ انہیں
 آئے ہوئے دو دن ہو چکے تھے اور ڈاکٹر جلال نے ایک
 دفعہ بھی تیمور کے متعلق بات نہیں کی تھی۔ جبکہ
 شائستہ بیگم دل ہی دل میں ہر وقت آل تو جلال تو کا ورد
 کرنے میں مگن رہتیں۔ ان دونوں کے درمیان گھریلو
 معاملات پر چھوٹی مولی گفتگو تو ہو رہی تھی مگر دونوں ہی
 اس متنازعہ موضوع پر بات کرنے سے کترارہے تھے۔
 ”یہ بینش نظر نہیں آرہی آج کل خیر تو ہے نا؟“
 انہوں نے ڈاکٹر جلال کو مخاطب کرنے کے لیے ان کی
 لاڈلی بیٹی کے بارے میں پوچھا۔

”شاید بڑی ہوگی کہیں۔۔۔“ انہوں نے مختصر جواب

دیا۔

”ارصم کی منگنی پر کیوں نہیں گئے آپ۔۔۔؟“ ابھی
 تک یہ بات ان کے ذہن میں اٹکی ہوئی تھی اس لیے
 جھٹ سے پوچھ لی۔

”ویسے ہی۔۔۔“ ان کے مختصر جواب پر وہ مایوس
 ہوئیں۔ اسی وقت کمرے کا دروازہ ہلکا سا کھٹکھٹا کر ماہیر
 بڑے عجلت میں اندر داخل ہوا۔

”بڑے ابا۔۔۔ کسی اچھے کارڈیا لوجسٹ کا تو بتائیں۔“

پاپا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ ماہیر اچھا خاصا گھبرایا
 ہوا تھا۔

”کسی بھی اسپتال کی ایمرجنسی میں لے جاؤ کوئی نہ
 کوئی کارڈیا لوجسٹ بیٹھا ہوگا۔“ ان کی بے رخی پر ماہیر
 کو ایک دم جھٹکا لگا۔

”کیا ہوا تیمور کو۔۔۔ خیریت تو ہے نا؟“ بڑی اماں کے
 فوراً ہی ہاتھ پیر پھولے۔

”کچھ نہیں ہوا انہیں۔“ ماہیر نے بے حد غصے سے
 بڑے ابا کی طرف دیکھا جو بڑے سکون سے اپنی کتاب
 پڑھنے میں مصروف تھے۔ ان کی بے حسی خاصی دل
 دکھانے والی تھی۔ وہ پاؤں پٹختا ہوا کمرے سے نکلا اور
 غصے کے اظہار کے طور پر اس نے بڑے زور سے
 دروازہ بند کیا تھا۔

اس کی اس بد تمیزی پر ڈاکٹر جلال کے چہرے پر
 ناگواری کا تاثر بڑی قوت سے ابھرا، لیکن وہ مصلحتاً
 خاموش رہے، کیونکہ ان کی بیگم صاحبہ جو اس باختہ
 انداز میں اپنے پوتے کے پیچھے جانے کے لیے اٹھی
 تھیں۔

”آگ لگ جائے ایسے اسپتال کو جہاں میرے
 بچے کا علاج نہیں ہو سکتا۔“ وہ کمرے سے نکلتے ہوئے
 بلند آواز میں بڑبڑاتیں۔ کھلے دروازے سے انہیں
 ملازموں کے بھاگنے، شائستہ بیگم اور اوریڈا کے رونے
 کی آوازیں بلند آواز میں آرہی تھیں، ایسا لگ رہا تھا
 جیسے باہر کوئی افراتفری کا سماں ہو۔ انہوں نے اٹھ کر
 کمرے کا دروازہ بند کیا، لیکن اپنی بیگم کے رونے کی
 آواز ان کے اعصاب پر بری طرح سے سوار ہو چکی
 تھی۔

”ڈرا ماہیر کو کال کرلو، اس کے باپ کی طبیعت
 خراب ہے۔“ انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی کو فون
 کر کے درخواست کی اور خود ایک دفعہ پھر اپنی کتاب
 کھول لی، لیکن اس دفعہ ایک لفظ بھی ان کے پلے
 نہیں پڑ رہا تھا۔ تنگ آکر وہ اپنے کمرے سے نکل
 آئے۔ سامنے ٹی وی لاؤنج کے صوفے سے ٹیک
 لگائے اوریڈا قالین پر افسردہ انداز میں بیٹھی تھی۔

انہیں دیکھ کر بھی وہ ویسے ہی سر جھکا کر بیٹھی رہی۔
 ”عدینہ کہاں ہے؟ ہاسٹل واپس چلی گئی کیا؟“
 انہوں نے یوں ہی اسے مخاطب کرنے کے لیے پوچھا۔
 ”جی۔۔۔“ اور یوں کالج بھگیا ہوا تھا، وہ شاید کافی دیر
 سے رو رہی تھی۔ اسی وقت آغا جی پریشان انداز میں
 ان کے پورشن میں داخل ہوئے۔

”بھائی جان! کس اسپتال میں لے کر گئے ہیں تیمور
 کو۔۔۔؟“ انہوں نے اندر داخل ہوتے ہی پریشانی سے
 پوچھا۔

”کیوں۔۔۔ تمہاری بات نہیں ہوئی ماہیر سے۔۔۔؟“ وہ
 الثاحیر ان ہوئے۔

”بات تو ہوئی تھی، لیکن وہ اس وقت ڈرائیو کر رہا
 تھا اس نے کچھ خاص بتایا نہیں۔“ وہ فکر مند انداز میں
 صوفے پر بیٹھ گئے۔

”دوبارہ کال کر کے دیکھ لیں۔“ انہوں نے حتی
 الامکان اپنے لہجے کو لا پرواہ کرنے کی کوشش کی، آغا جی
 فوراً ہی ماہیر کا نمبر ملانے لگے، دوسری طرف بیل
 جاری تھی، لیکن کال انینڈ نہیں کی جارہی تھی۔
 انہوں نے تنگ آ کر فون بند کر دیا۔ دونوں بھائی اگلے
 ایک گھنٹے تک یوں ہی بیٹھے رہے۔ ماہیر کسی کا بھی فون
 انینڈ نہیں کر رہا تھا، وہ سب ہی سے خفا ہو چکا تھا۔



”لگتا ہے آج کوئی خاص مہمان آنے والا ہے۔“
 بے بے نے صحن میں مٹر گشت کرتی مرغیوں کے آگے
 باجرہ ڈالتے ہوئے، مونو کو مخاطب کیا، جو گیلے کپڑوں کا
 ٹب اٹھائے غسل خانے سے نکل رہی تھی۔ اس کے
 چہرے پر تھکن اور بے زاری کا عنصر غالب تھا۔

”آپ کو کیسے پتا چلا۔۔۔؟“ مونو نے دھلے ہوئے
 کپڑوں کا پانی مزید نچوڑا۔

”صبح سے منڈیر پر بیٹھا کوا جو کائیں کائیں کر کے سر
 کھا رہا ہے۔“ انہوں نے ہش ہش کر کے مرغیوں کو
 پودوں کی طرف جانے سے روکا۔

”بے بے کوؤں اور کبوتروں والا ٹائم گزر گیا اب

”بھاڑ میں جائے یہ موامبیل۔۔۔“ بے بے نے برا
 سامنے بنایا۔

”اس نے تو پرونوں (مہمانوں) کو دیکھ کر اچانک ملنے
 والی خوشی ہی چھین لی۔۔۔“

”بے بے آج کل کے دور میں کوئی خوش نہیں ہوتا
 مہمانوں کے آنے سے۔۔۔“ مونو نے بے زاری سے
 ان کی معلومات میں اضافہ کیا۔ وہ صبح سے کپڑے دھو
 دھو کر تھک چکی تھی، لیکن ابھی بھی آپا کو تفصیلی صفائی
 کی دھن سوار تھی۔

”اس لیے تو گھروں میں اتنی بے برکتی ہے، پورا پورا
 ٹبر کما رہا ہوتا ہے اور پھر بھی سب ہی رو رہے ہوتے
 ہیں۔“

”کپڑے پھیلا کر صالچہ کو ایک کپ دودھ گرم کر کے
 دے دینا، اس نے دوائی کھانی ہے۔“ بے بے نے مونو
 کو مخاطب کیا۔

”اچھا ابھی دیتی ہوں۔“ مونو نے خالی ٹب اٹھایا اور
 غسل خانے کی طرف بڑھی ہی تھی کہ باہر کے
 دروازے پر کسی نے دستک دی۔

”مونو۔۔۔ باہر دیکھو کون آیا ہے؟“ بے بے نے
 وہیں سے بیٹھے بیٹھے اس سے کہا تو وہ ٹب زمین پر رکھ
 کر دروازہ کھولنے چلی گئی اور جیسے ہی اس نے گیٹ
 کھولا اسے خوش گوار حیرت کا جھٹکا لگا۔ سامنے عبداللہ
 سر جھکائے اپنی والدہ کے ساتھ کھڑا تھا۔ اگر عدینہ نے
 اس کے زندہ ہونے کی اطلاع نہ دی ہوتی تو شاید اس
 وقت مونو خوف کے مارے بے ہوش ہو چکی ہوتی۔

”ارے خالہ آپ۔۔۔ آمیں نا اندر، باہر کیوں کھڑی
 ہیں۔“ خوشی مونو کے لہجے سے چھلکی۔

”ہاں بھئی میاں! تم کون سی قبر سے کفن پھاڑ کر
 نکل آئے۔“ بے بے کو آپا صالچہ بتا چکی تھیں۔ ان
 کے طنزیہ انداز پر وہ شرمندہ ہوا۔

”مونو مہمانوں کو بیٹھک میں بٹھا دو میں صالچہ کو

اٹھاتی ہوں۔“ موتا نے انہیں فوراً بیٹھک میں بٹھایا اور خود باورچی خانے کی طرف چلی آئی، آپا کے کپے بغیر اس نے جلدی جلدی چائے کا پانی رکھا اور خود بسکٹ پلیٹوں میں ڈال کر انڈے ابالنے لگی۔ اس وقت گھر میں جو کھانے کو موجود تھا، وہ سب رکھ کر جب وہ بیس پچیس منٹ کے بعد بیٹھک میں آئی تو اندر کا ماحول خاصا سرد تھا۔ آپا کے چہرے پر پھیلا غصہ اور ناراضی دور ہی سے نظر آرہی تھی۔

”تم تو خود اچھے خاصے باشعور، سمجھ دار اور سلجھے ہوئے لڑکے تھے، پوری ایمان داری سے بتاؤ ایسی کون سی غلط بات کہہ دی تھی میں نے جو تم منہ چھپا کر ایسے غائب ہوئے کہ سارے ہی رابطے ختم کر ڈالے۔“ آپا صالحہ اگرچہ بیمار تھیں لیکن ان کا لہجہ ابھی بھی خاصا جان دار تھا۔ وہ اپنے سامنے شرمندگی سے سر جھکا کے بیٹھے عبد اللہ کی ٹھیک ٹھاک کلاس لے رہی تھیں۔

”یہ تمہارے سامنے بیٹھا ہے صالحہ، سو جوتے بھی مارو گی تو آف نہیں کرے گا۔“ عبد اللہ کی والدہ نے خفت زدہ لہجے میں کہا۔

آج کل کے بچے کھاتے کہاں ہیں جوتے، الٹا والدین کو ہی بھگو بھگو کر مارتے ہیں۔ ان کا غصہ کسی صورت کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

”میں نے اتنا سمجھایا تھا اسے، کم از کم اپنی خیریت کی تو اطلاع دے دو، لیکن اس نے میری ایک بات نہیں مانی۔“ عبد اللہ کی والدہ بھی آج اپنے بیٹے کی حمایت کے موڈ میں نہیں تھیں۔

”ہم اس کے کیا لگتے تھے جو یہ ہمیں اطلاع دیتا۔“ آپا صالحہ کا لہجہ غم سے لبریز ہوا۔ انہیں حقیقتاً عبد اللہ پر بہت غصہ آ رہا تھا۔

”میں کچھ بن کر آپ کے پاس آنا چاہتا تھا۔“ وہ تھوڑا سا جھک کر بولا۔

”بیٹا! تم شاید بھول رہے ہو، میں نے اس وقت اپنی بیٹی کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں تھمانے کی بات کی تھی، جب تم کچھ بھی نہیں تھے۔“ آپا صالحہ کے رنجیدہ لہجے

پر وہ ایک دفعہ پھر شرمندہ ہوا۔

”آپا! میں آپ سے معافی کا طلب گار ہوں اور اس وقت تک یہاں سے نہیں جاؤں گا، جب تک آپ مجھے معاف نہیں کریں گی۔“ اس نے خفت زدہ انداز میں اپنا سر مزید جھکا لیا۔

”بیٹا! ہم کون ہوتے ہیں معاف کرنے والے، ہماری بساط ہی کیا ہے۔ معافی مانگنی ہے تو اللہ سے مانگو۔“ انہوں نے بے رخی کی انتہا کر دی۔

”اچھا اچھا اب غصہ تھوک دے صالحہ۔“ بے نے محتاط انداز میں گفتگو میں حصہ لیا۔ ”گھر چل کر تو اگر دشمن بھی آجائے تو اسے معاف کر دینا چاہیے۔“

”تمہارا کون سا اس کے ساتھ دشمنی والا تعلق تھا بے بے۔“ آپا صالحہ نے انہیں یاد دلایا۔

”جو بھی ہے قطع تعلقی اللہ کو پسند نہیں۔“ بے نے موتا کو اشارہ کیا، وہ جلدی جلدی تھراس سے چائے نکال کر پیالیوں میں ڈالنے لگی۔

”تو اس کا مطلب ہے۔۔۔ آپ مجھے معاف نہیں کریں گی۔“ عبد اللہ نے پہلی دفعہ پریشان انداز میں آپا صالحہ کا چہرہ دیکھا، ایک نظر میں ہی وہ اسے کافی بیمار اور بوڑھی لگی تھیں۔ ایک نامعلوم سی بے چینی نے اس کے وجود کو گھیرا۔

”آپ کی طبیعت ٹھیک ہے آپا۔“ اس کے تشویش زدہ انداز پر آپا صالحہ نے بے اختیار نظریں چرائیں۔ عبد اللہ انہیں اپنی سگی اولاد کی طرح عزیز تھا اور سچ بات تو یہ تھی کہ اس کی موجودگی میں انہیں کبھی بھی بیٹے کی کمی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ آج اسے دیکھ کر ان کے زخموں کے سارے ٹانگے ادھر گئے تھے۔

”ہاں ٹھیک ہوں میں۔“ ان کا لہجہ اس دفعہ خاصا مدہم تھا۔

”مدرسہ کیسا چل رہا ہے؟“ اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”اللہ کا بہت کرم ہے، کسی کے جانے سے دنیا کے کام نہیں رکتے، یہاں تو پھر دینی تعلیم کا کام تھا، اللہ نے

ہماری نجات کا کچھ نہ کچھ سامان پیدا ہو ہی جائے گا۔“
عبداللہ کی باتیں ہمیشہ کی طرح آپا صالحہ کے دل پر اثر کرنے لگی تھیں۔

یہی وجہ تھی کہ دو گھنٹے کی اس ملاقات کے بعد عبداللہ جب اٹھا تو آپا کے دل پر چھائی بدگمانی کی کثافت آخر کار دھل ہی گئی تھی۔



بختاور اور ہاشم کی — خوش حال زندگی کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ اگلے پانچ ماہ میں بختاور کے گھر میں بی وی سمیت بہت سی الیکٹرانک اشیاء کا اضافہ ہو چکا تھا۔ سیموئیل کے ساتھ پارٹنرشپ ہاشم کو اس آگئی تھی اور اوپر سے اس کی دکانیں دوبارہ سے کرائی پر چڑھ گئیں تھیں اس لیے معاشی لحاظ سے وہ دونوں اب خاصے پرسکون تھے جب کہ بختاور نے اپنی نوکری ابھی تک نہیں چھوڑی تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ ریگیننسی کے آخری مہینے میں جاب چھوڑ دے گی کیونکہ ہاشم اپنے پبلشنگ ادارے میں خاصا مصروف ہو چکا تھا وہ صبح نو بجے کا گیا ہوا رات کو دس گیارہ بجے کے بعد ہی لوٹا تھا — جمعے کا دن تھا اور وہ چھٹی کی وجہ سے گھر میں تھی کہ پی ٹی سی ایل فون پر نیلم کی کال آگئی وہ خاصی خوش تھی۔

”ریلی تمہاری شادی ہو رہی ہے۔۔۔؟“ بختاور اس اطلاع پر ایک دم خوش ہو گئی۔

”ایک بات کان کھول کر سن لو بختاور، اگر تم میری شادی پر نہ آئیں تو میں سخت خفا ہو جاؤں گی تم سے۔“
دوسری طرف موجود نیلم نے اسے دھمکی دی۔
”ایسا ہو سکتا ہے بھلا۔۔۔؟“ بختاور کھلکھلا کر ہنسی۔

”تمہاری وجہ سے میں نے شادی کی ڈیٹ کافی لیٹ کی ہے اب تم میرے بھانجیا بھانجی کے ساتھ پہنچ جانا۔“ نیلم نے ہنستے ہوئے اسے یاد دلایا۔

”اچھا اچھا“ اب کتنی دفعہ احسان جتاؤ گی تم اس بات کا۔“ بختاور نے مصنوعی ناراضی سے کہا۔

”وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ایک دفعہ پھر طر کر گئیں۔“

”آپا۔۔۔ آپ جو مرضی کہیں لیکن پلیز اپنا دل صاف کر لیں میری طرف سے۔“ عبداللہ نے دو ٹوک انداز میں بات کرنے کی ٹھان لی۔

”میاں۔۔۔ ہمارے دل صاف کرنے سے کیا ہوتا ہے بس تم خوش رہو، آباد رہو۔“ وہ تھوڑا سا افسردہ ہوئیں۔ عبداللہ ایک دم اٹھا اور ان کے قدموں میں آکر بیٹھ گیا۔ وہ بوکھلا سی گئیں۔

”بیٹا! یہ کیا کر رہے ہو تم۔۔۔؟“ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئیں، مونہے اپنے چہرے پر آنے والی مسکراہٹ کا گلا بڑی مشکل سے گھونٹا تھا۔ اس کی لائی ہوئی چائے کیوں میں پڑے پڑے ٹھنڈی ہونے لگی۔ کمرے کا ماحول ابھی بھی سرد تھا۔

”آپ جب تک مجھے معاف نہیں کریں گے میں اپنی جگہ سے نہیں اٹھوں گا۔“ اس کی نگاہیں جھکی ہوئی لیکن لہجہ بے لچک تھا۔

”اچھا اچھا معاف کیا اب اٹھ کر کرسی پر بیٹھو۔ پی ایچ ڈی تک پہنچ گئے لیکن حرکتیں ابھی بھی بچوں جیسی ہی ہیں تمہاری۔“ آپا صالحہ اپنے مخصوص شفقت بھرے انداز میں گویا ہوئیں تو کمرے میں موجود سب افراد کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”تو پھر میں کب سے اپنا مدرسہ سنبھالنے آؤں۔“ عبداللہ کی اگلی فرمائش نے آپا صالحہ کو ہکا بکا کر دیا۔ وہ بھونچکا ہو کر اس کی سنجیدہ شکل دیکھنے لگیں۔
”تم پی ایچ ڈی کر کے اب مدرسہ سنبھالو گے کیا۔۔۔؟“ انہوں نے ذرا سا سنبھل کر کہا۔

”آپ سے زیادہ کون جان سکتا ہے یہ کہ ہمارے دینی مدرسوں کو پڑھے لکھے لوگوں کی ضرورت ہے آپا۔“ وہ سنجیدگی سے مزید گویا ہوا۔

”پڑھے لکھے لوگ ان بچوں کے ناپختہ ذہنوں میں جو فیڈ کریں گے اسی سے ان کے مستقبل کی راہیں متعین ہوں گی۔ ہم اپنے مدرسے سے چند سو بھی اچھے مسلمان بنانے میں کامیاب ہو گئے تو آخرت میں

تمہارے بچوں کے لیے مسئلے کا باعث بنے گی۔“ نیلم کی بات پر وہ ایک دم پریشان ہو کر بولی۔ ”وہ کیسے؟“ ”دیکھو ناں، کل کو اگر ہاشم بھائی نے اپنے نظریات اپنے بچوں پر ٹھونسنے کی کوشش کی تو۔۔۔؟“ بخٹاور اس کی بات سن کر خوفزدہ ہوئی۔

”اللہ نہ کرے یار! اس کے منہ سے بے اختیار پھسلا۔ نیلم کی اس بات کے بعد اس کا ایک دم ہی ساری گفتگو سے دل اچاٹ ہو گیا تھا تب ہی تو اس نے دو چار باتیں کر کے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔ نیلم کے ساتھ ہونے والی تازہ تازہ باتوں کا ہی اثر تھا جو رات کو ہاشم کو کھانا دیتے ہوئے اس نے دانستہ ہی موضوع چھیڑ دیا۔

”ہاشم آپ کے خیال میں اس دفعہ ہمارے ہاں بیٹا ہو گا یا بیٹی؟“ اپنی پلیٹ میں مٹن پلاؤ نکالتے ہوئے وہ اس کی بات پر مسکرایا۔

”بیٹا۔۔۔“ وہ اس کے بر اعتماد انداز پر خیران ہوئی۔ ”آپ کیسے اتنے یقین سے کہہ رہے ہیں؟“

”مجھے پتا ہے اس دفعہ بیٹا ہی ہو گا۔“ اس نے سلاوا اپنی پلیٹ میں ڈالا اور مزے سے کھانے لگا۔

”اور اگر بیٹی ہو گئی تو۔۔۔؟“ اس نے تھوڑا سا جھجک کر پوچھا۔ ایک لمحے کو ہاشم کا چہرہ تاریک ہوا اور ساتھ ہی اس نے جھٹ سے نفی میں سر ہلا دیا۔

”نہیں اس بار ایسا نہیں ہو گا۔“ وہ سر جھٹک کر ایک دفعہ پھر کھانا کھانے لگا۔

”پتا ہے ہاشم، میرا بیٹا ہوا ناں تو میں اسے قرآن پاک حفظ کرواؤں گی۔“ بخٹاور کے بر جوش انداز پر ہاشم سے نوالہ ٹکنا مشکل ہو گیا۔ اسی لمحے اسے کھانسی آئی اور لقمہ گلے میں اٹکا اور وہ بری طرح کھانسنے لگا۔ بخٹاور نے گھبرا کر پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھایا، چند ہی سیکنڈ میں ہاشم کا منہ ٹماٹر کی طرح سرخ ہو گیا، بخٹاور جلدی سے اٹھ کر اس کی پشت سہلانے لگی۔

”میں ٹھیک ہوں اب۔۔۔“ ہاشم نے نشو سے منہ صاف کیا۔

”کتنی دفعہ کہا ہے کہ کھانا کھاتے ہوئے بولتے

”تمہیں پتا ہے ناں میں اپنے والدین کی اگلوٹی بیٹی ہوں اور میری شادی پر میری بہن اور دوست کا کردار تم نے ہی ادا کرنا ہے۔“ دوسری طرف نیلم کچھ اداس ہوئی۔

”تم ٹینشن ہی مت لو، میں انشاء اللہ پورے دس دن پہلے پہنچ جاؤں گی۔“ بخٹاور نے اسے اپنے ارادوں سے آگاہ کیا۔

”ہاشم بھائی اتنے دن پہلے آنے کی اجازت دے دیں گے ناں۔“ اسے یقین نہیں آیا تھا۔

”ارے اب ان کی کوئی ٹینشن نہیں، وہ دن رات اپنا بزنس پھیلانے میں لگے ہوئے ہیں۔“ بخٹاور نے اسے مطمئن کیا۔

”ان کے گھر سے دوبارہ کوئی نہیں آیا۔“ نیلم نے تھوڑا سا جھجک کر پوچھا۔

”نہیں یار! ان کے بڑے بھائی نے بھی دوبارہ جھانک کر بھی نہیں دیکھا۔“ بخٹاور نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

”بخٹاور ایک بات پوچھوں، اگر تم برا نہ مانو تو۔۔۔؟“ نیلم پھر ہچکچائی۔

”کمال کرتی ہو نیلم تم، اب تم بھی غیروں جیسی باتیں کرو گی کیا؟“ اس نے فوراً ہی اسے جھاڑا۔

”اصل میں تم نے بتایا ہی نہیں کہ ہاشم بھائی اب نماز وغیرہ پڑھتے ہیں کہ نہیں؟“ نیلم کی بات پر بخٹاور ایک دم افسردہ ہوئی۔

”سچ کہو تو یار وہ اس ٹاپک پر ایک لفظ بھی سننے کو تیار نہیں ہوتے، تنگ آکر میں نے بھی انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا ہے۔“

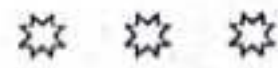
”لیکن یہ اچھی بات نہیں ہے بخٹاور۔“ نیلم پریشان ہوئی۔

”تو کیا کروں یار، روز روز کے جھگڑوں سے مجھے ٹینشن ہوتی ہے۔“ بخٹاور نے اسے اپنی مجبوری سے آگاہ کیا۔

”لیکن ایک مسلمان کی حیثیت سے تمہیں ان کے عقائد کی تصحیح کرنی چاہیے، ورنہ کل کو یہ بات

نہیں ہیں۔۔۔ وہ خفا ہوئی۔ ”اور کتنی دفعہ سمجھایا ہے تمہیں کہ مجھ سے ایسے ٹاپک بریات مت کیا کرو۔“ وہ ہلکا سا برہم ہوا۔

”کیسے ٹاپک برہم؟“ بخشاور کو اپنی بات بھول چکی تھی اس لیے وہ تعجب بھری نگاہوں سے اپنے شوہر کا چہرہ دیکھنے لگی۔ جس کی کھانے سے دلچسپی بالکل ختم ہو گئی تھی اور وہ بے زاری سے رے پرے کر کے اب ٹی وی دیکھنے میں مگن ہو چکا تھا۔



ماہیر، سرمد کے ساتھ اے ایف آئی سی (آرٹ فورس انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی) کی پارکنگ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر حد درجہ پریشانی تھی۔ تیمور کے سینے میں ایک دم درد اٹھا تھا اور وہ لوگ گھبرا کر انہیں اسپتال لے آئے تھے۔ جہاں انہیں ابتدائی طبی امداد کے بعد داخل کر لیا گیا تھا۔

”بڑے ابا سے مجھے اس قدر بے حسی کی امید نہیں تھی۔“ ماہیر ان سے اچھا خاصا خفا ہو چکا تھا۔

”اچھا تم اپنا دل برا مت کرو۔“ ان دونوں کے درمیان تعلقات ٹھیک ہو جائیں گے۔“ سرمد نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئی اسے تسلی دی۔

”یار! حد ہوتی ہے ہریات کی ایسی بھی کیا ناراضی کہ انسان اپنے پروفیشن کے تقاضے ہی بھول جائے۔“ اس نے بے زاری سے گاڑی کا دروازہ کھولا اور بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھے ہی سرمد نے گاڑی اشارٹ کی۔ وہ دونوں اسپتال سے گھر جا رہے تھے کیونکہ اسپتال میں کسی امینڈنٹ کو رکنے کی اجازت نہیں تھی۔

”مجھے بابا کو بائی پاس سرجری کے بعد یہاں لانا ہی نہیں چاہیے تھا۔“ اس نے سنجیدگی سے کہہ کر سیٹ کالیور کھینچا اور آرام وہ انداز میں بیٹھ گیا۔

”شکر ہے تم نے بڑی اماں کو گھر بھجوا دیا ورنہ بڑی مشکل ہو جاتی۔“ سرمد گاڑی کو اسپتال سے نکال کر پشاور روڈ کی طرف لے آیا۔

”بڑی مشکلوں سے تو راضی ہوئی تھیں وہ۔۔۔“ ماہیر خاصا تھک چکا تھا اس لیے آنکھیں بند کر کے اس کے ساتھ محو گفتگو تھا۔ دونوں نے شام سے کافی بھاگ دوڑ کی تھی۔

وہ تو سرمد کی والدہ طیبہ کی ایک کولیگ، پروفیسر کی حیثیت سے یہاں جاب کر رہی تھیں اس لیے انہیں کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

”شانزے کہاں گم ہے؟ تم نے اسے بتایا نہیں؟ میں پاکستان آچکا ہوں۔“ ماہیر نے ایک دم ہی آنکھیں کھولیں تو سرمد بوکھلا گیا، کیونکہ سامنے سگنل کے دائیں طرف لگے بل بورڈ پر شانزے کے سیریل کا بڑا سا ایڈ لگا ہوا تھا جس پر شانزے کا مسکراتا ہوا چہرہ دور ہی سے لشکارے مارتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

”ابھی کچھ دن اور نہ ہی بتاؤ تو اچھا ہے ورنہ اس کا شکایت نامہ شروع ہو جائے گا۔“ سرمد نے سگنل کھلتے ہی تیزی سے اپنی گاڑی نکالی اور سکون کا سانس لیا کہ ماہیر کی اس بل بورڈ پر نظر نہیں پڑی تھی۔

”ویسے کر کیا رہی ہے وہ آج کل۔۔۔؟“ وہ دوبارہ آنکھیں موند چکا تھا۔

”کوئی خاص آئیڈیا نہیں، کیونکہ میں خود پچھلے دنوں ایک کمرشل کے شوٹ میں کافی بڑی تھا۔“ سرمد نے صاف اسے ٹالا تھا۔ وہ پریشانی کے اس موقع پر اسے ایک اور بری خبر نہیں سنانا چاہتا تھا کیونکہ اتنا تو اسے بھی اندازہ تھا کہ ماہیر کو اس کا شو بزم میں کام کرنا سخت ناپسند تھا۔

”فارغ تو وہ بیٹھ نہیں سکتی یقیناً“ کچھ نہ کچھ تو کر رہی رہی ہوگی وہ۔“ ماہیر اس کی رگ رگ سے واقف تھا۔

”تم چھوڑو اسے، یہ بتاؤ شادی کا کیا پروگرام ہے؟“

”پاپازا ٹھیک ہو جائیں تو انہیں شانزے کی پھپھو کے گھر لے کر جاؤں گا۔“ وہ اسے اپنے ارادے بتا رہا تھا۔ دونوں باتیں کرتے ہوئے گھر تک پہنچ چکے تھے جیسے ہی سرمد نے گاڑی اندر داخل کی، سامنے بینش بڑی تیزی سے پورچ میں کھڑی اپنی گاڑی کی طرف

برہم رہی تھیں۔
 ”اسلام علیکم آئی کیسی ہیں آپ۔۔۔؟“ سرد نے
 گاڑی سے اترتے ہی انہیں سلام جھاڑا۔
 ”فائن۔۔۔“ وہ ماہیر کو نظر انداز کر کے اپنی گاڑی کی
 طرف برہم گئیں۔

”ساری دنیا بدل سکتی ہے لیکن یہ لوگ نہیں۔۔۔“
 ماہیر نے اندر کی جانب بڑھتے ہوئے بے زاری سے
 کہا۔

”کون لوگ۔“ سرد اپنے سیل فون پر آیا۔
 ٹیکسٹ پڑھتے ہوئے بے دھیانی سے بولا۔
 ”بڑے ابا اور بینش پچھپی صاحبہ۔۔۔“ ماہیر نہ
 جانے کس بات پر بری طرح چڑا ہوا تھا۔
 ”شرم کرو۔“ تمہارے پیپا کی سابقہ منگیتر ہی ہیں
 یہ خاتون۔۔۔“ سرد نے منٹے ہوئے اسے چھیڑا۔

”میں تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں پار کہ پیپا نے عقل
 مندی کا فیصلہ کرتے ہوئے شادی نہیں کی ان سے
 ورنہ ایسی سڑیل مدر کو برداشت کرنا آسان کام تھوڑی
 تھا۔“ ماہیر کی بات پر سرد کھلکھلا کر ہنسا۔ ”یہ تو تم
 ار صم بے چارے سے پوچھو۔“

”اس کی تو مجبوری ہے یار“ اب فادر بھی زندہ نہیں
 اس کے ورنہ سوتیلی ہی سہی ایک اور مدر لے آتا
 مارکیٹ سے۔“ ماہیر غیر سنجیدگی سے گویا ہوا۔
 ”شرم کرو“ ار صم سن لے تو کیا سوچے۔“ سرد
 نے مسکرا کر کہا۔

”اس کی تو لگتا ہے آج کل سوچنے سمجھنے کی ساری
 حسیں ختم ہو چکی ہیں“ داغ کہیں اور ہوتا ہے اور دل
 کہیں اور ہوتا ہے۔“ ماہیر نے بے لاگ تبصرہ کیا۔ وہ
 دونوں اندر داخل ہو چکے تھے۔ سامنے لاؤنج میں اوریدا
 بڑے ابا کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی اس کی نظریں ٹی وی
 پر جمی ہوئی تھیں جبکہ بڑے ابا صبح کا باسی اخبار دوبارہ
 پڑھ رہے تھے۔ بڑے ابا کو دیکھتے ہی ماہیر کو دوپہر کی
 ساری ٹینشن دوبارہ یاد آگئی اور ساتھ ہی اس کا اچھا
 خاصا موڈ خراب ہو گیا۔

”بھائی پیپا کیسے ہیں اب۔۔۔؟“ اوریدا ان دونوں کو

دیکھ کر فوراً ”کھڑی ہوئی۔“
 ”بس دعا کرو۔۔۔“ ماہیر نے مختصر جواب دیا اور
 بڑے ابا کو نظر انداز کر کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔
 ڈاکٹر جلال نے بطور خاص اس کا یہ انداز نوٹ کیا تھا وہ
 سرد سے اس کا حال احوال پوچھنے لگے۔ انہوں نے
 ابھی بھی تیمور کی طبیعت کا نہیں پوچھا تھا۔ ماہیر کو ایک
 دم ہی ان کی بے حسی پر غصہ آیا۔
 ”بھائی پیپا کب آئیں گے گھر۔۔۔؟“ اوریدا اس کی
 اندرونی کیفیت سے بے خبر اپنی ہی دھن میں سوال
 کر رہی تھی۔

”پتا نہیں۔۔۔“ ماہیر بڑے ابا کی موجودگی میں کھل
 کربات کرنا نہیں چاہ رہا تھا۔
 ”طبیعت تو ٹھیک ہے نا ان کی۔۔۔“ اسے تسلی نہیں
 ہوئی۔

”اوریدا کیا پر اہلم ہے تمہارے ساتھ؟ تم کوئی بچی
 ہو جسے اتنا نہیں معلوم کہ اگر کسی شخص کو اسپتال میں
 ایڈمٹ کر لیا جائے تو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ خواہ
 محتوہ بے تک سوال کر کے سرکھار ہی ہو۔“ وہ جھنجھلا کر
 اٹھا اور ہاتھ میں پکڑا رہیموٹ غصے سے کارپٹ پر پھینکا
 اور اپنے کمرے کی طرف برہم گیا۔ اوریدا اور سرد
 دونوں نے پریشانی سے اس کا یہ روپ دیکھا۔

”سرد بھائی! پیپا کی طبیعت زیادہ خراب ہے
 کیا۔۔۔؟“ اوریدا کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر سرد کے
 دل کو کچھ ہوا۔

”کیوں ٹینشن لے رہی ہو اوریدا؟ ٹھیک ہو جائیں
 گے وہ۔“ سرد نے اسے دلاسا دینے کی کوشش کی
 لیکن اوریدا اپنے مچلتے ہوئے آنسو روکنے کی کوشش
 میں ہلکان ہو رہی تھی۔ بڑے ابا کچھ سوچ کر اٹھے اور
 لاؤنج سے نکل گئے۔

”پاگل تو نہیں ہو گئی ہو تم۔ اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں
 پر بھی کوئی روتا ہے بھلا؟“ وہ اس کے کندھے پر ہاتھ
 رکھے نرمی سے اسے دلاسا دینے کی کوشش کر رہا تھا
 لاؤنج میں ار صم کے ساتھ داخل ہوتے آغا جی نے یہ
 منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ار صم کے اندر چھن

”انہیں لگتا ہے کہ ان کے بیٹے پر گھر کے کسی ڈاکٹر نے کوئی توجہ نہیں دی؟“ وہ سنجیدہ انداز میں ان کی ناراضی کی وجہ بتانے لگے۔ وہ جب سے اسپتال سے آئی تھیں اسی طرح سے سب اکھڑی اکھڑی ہوئی تھیں اور ملازموں کی الگ شامت آئی ہوئی تھی۔

”پھر تو یہ ناراضی ان کا حق بنتی ہے، آپ کو جانا چاہیے تھا ساتھ۔“ آغا جی نے محتاط انداز میں کہا۔

”نقیں مگر بھی ایسا نہیں کر سکتا۔“ وہ ابھی تک تیمور سے خفا تھے۔ اسی وقت ماہیر ست انداز میں کمرے میں داخل ہوا۔

”آغا جی آپ نے بلایا تھا مجھے۔“

”بیٹا تیمور کو کہاں لے کر گئے تھے تم اور کیسی طبیعت ہے اب اس کی؟“ وہ فکر مندی سے پوچھ رہے تھے۔

”آغا جی۔ آپ کے اسپتال کے علاوہ بھی بہت اچھے اسپتال موجود ہیں اس شہر میں۔“ اس کا طنزیہ انداز آغا جی کے لیے بالکل نیا تھا وہ سمجھ گئے۔ کہ وہ بھی بڑی اماں کی طرح ان سب سے بدگمان ہو چکا ہے۔

”بیٹا، مجھے تو بھائی جان نے کہا تھا تم سے رابطہ کرنے کو۔“ انہوں نے بوکھلا کر اپنی صفائی دی جبکہ ماہیر کے سامنے اس بات پر ڈاکٹر جلال جزبہ سے ہو کر رہ گئے۔ تیمور نے غور سے بڑے ابا کا چہرہ دیکھا اور سنجیدگی سے گویا ہوا۔ ”اے ایف آئی سی میں ایڈمٹ کروادیا ہے انہیں؟“

”وہاں میرے بہت اچھے دوست ڈاکٹر فاروق ہیں، میں ان سے بات کرتا ہوں۔“

”آغا جی اس کی ضرورت نہیں ہے اب۔“ ماہیر نے جلدی سے ان کی بات کاٹی۔ ”میرے ایک دوست کے فادر ہیں وہاں ان شاء اللہ کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔“ ماہیر نے بھی آج ان سب کو شرمندہ کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔

”چلو ٹھیک ہے۔ اب نیکسٹ ٹائم تم اسپتال جاؤ تو مجھے ساتھ لے کر جانا۔“ انہوں نے محتاط لہجے میں کہا۔

سے کچھ ٹوٹا، اب بھی اوریدا کے ارد گرد سردی موجودگی اس کے لیے اذیت کا باعث بنتی تھی۔

”بیٹا، تیمور کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ آغا جی اوریدا کو روتا دیکھ کر بوکھلا گئے۔ جب کہ وہ اپنی ہتھیلی کی پشت سے اپنی آنکھیں بے دردی سے رگڑتے ہوئے لاؤنج سے نکل گئی۔ وہ ارصم کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی۔

”نکل تیمور بہتر ہیں لیکن۔۔۔ مکمل ٹھیک ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔“ سرد نے انہیں صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”تیمور کو بانی پاس سرجری کے بعد فوراً اتنی لمبی ٹریولنگ نہیں کرنی چاہیے تھی۔“ آغا جی نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

”جی وہ تو نہیں کرنا چاہتے تھے، لیکن بڑی اماں کی ضد کے آگے انہیں سر جھکانا پڑا۔“ سرد نے انہیں اصل بات بتائی۔

”ٹھیک ہے۔ میں بھائی جان کے کمرے میں جا رہا ہوں تم ذرا ماہیر کو بھیجو وہاں۔“ آغا جی ارصم کے ساتھ ڈاکٹر جلال کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

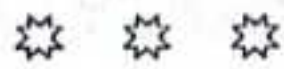
وہاں ایک اور منظر ان کا منتظر تھا، بڑی اماں بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے افسردہ انداز میں نیم دراز تھیں۔ انہوں نے سیاٹ نظروں سے آغا جی اور ارصم کی طرف دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ان کی آنکھیں متورم اور چہرہ بہت زیادہ رونے کی وجہ سے سرخ ہو چکا تھا جو سفید رنگ کے دوپٹے میں اور زیادہ نمایاں ہو رہا تھا۔

پھر وہ بے زاری سے انھیں اور اپنی چپل پہن کر کمرے سے نکل گئیں۔ آغا جی اور ارصم دونوں نے حیرانی سے جلال صاحب کی طرف دیکھا۔

”بھابھی کو کیا ہوا۔۔۔؟“ آغا جی ایک دم پریشان ہوئے۔

”ناراض ہیں وہ سب سے۔“ ڈاکٹر جلال کے جواب نے انہیں مزید تشویش میں مبتلا کیا۔ ”لیکن کیوں۔۔۔؟“

”جی، ٹھیک ہے اب میں جاؤں۔“ وہ ابھی تک خفا خفا سالگ رہا تھا۔ اس کے کمرے سے نکلتے ہی آغا جی نے شکایتی نظروں سے ڈاکٹر جلال کی طرف دیکھا۔ انہیں بھی اپنے بھائی کا یہ طرز عمل اچھا نہیں لگا تھا۔ ”بھائی جان گلے شکوے اور ناراضگیاں زندہ انسانوں کے ساتھ ہوتی ہیں اور اس کے بعد تو بس افسوس ہی رہ جاتا ہے۔“ آغا جی نہ چاہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہہ گئے تھے ڈاکٹر جلال کے سپاٹ چہرے پر ایک اضطراب کی لہر دوڑی، لیکن وہ اس موقع پر کچھ بھی نہیں بولنا چاہتے تھے اور ویسے بھی اب بولنے کے لیے کچھ تھا بھی نہیں ان کے پاس اس لیے کمرے میں ایک چھینے والا سناٹا پھیل گیا۔



بہت سال پہلے ایسی ہی ایک افسردہ شام کو شائستہ بیگم نے تیمور اور بندیا کا نکاح خاموشی سے پڑھوا دیا تھا۔ اس کے بعد ہر وقت ان کے دل کو دھڑکا لگتا رہتا کہ کہیں کسی کو پتا نہ چل جائے لیکن دس دن گزرنے کے بعد آہستہ آہستہ وہ خود ہی مطمئن ہو گئی تھیں۔ تیمور جانے سے پہلے بندیا کا آئی ڈی کارڈ اور بہت سے کاغذات خاموشی سے بنوا رہا تھا۔ بندیا کے ہونٹوں پر بھی خاموشی کی مہر لگ گئی تھی۔ ڈیڑی کی شادی کے بعد یہ دوسری شادی تھی جو خاصے عجیب حالات میں ہوئی تھی۔

”کل طیبہ اور صلاح الدین کا نکاح ہے۔“ ڈاکٹر جلال کی اطلاع پر شائستہ بیگم کا دل دکھ کے گہرے احساس سے بھر گیا اور انہیں یقین ہو گیا تھا کہ ان کی قسمت میں اپنی اولاد کی شادی کی خوشیاں نہیں ہیں۔ کسی ایک کی شادی پر بھی وہ اپنے چاؤ پورے نہیں کر سکی تھیں۔ گھر میں طیبہ کے نکاح کی تیاریاں بے دلی سے شروع ہو گئی تھیں۔ تیمور اور اس کی ماں کے اعتراضات کو جلال صاحب نے ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیا تھا۔ اگلے دن گنتی کے چار لوگ آئے اور طیبہ کا نکاح بڑی خاموشی سے صلاح

الدین سے پڑھوا دیا گیا۔ ”میں ساری زندگی بابا سے بات نہیں کروں گی۔“ طیبہ نے نکاح نامے پر دستخط کر کے فلم غصے سے میز پر پھینکا۔

”اللہ تمہاری قسمت اچھی کرے۔“ بڑی اماں نے روتے ہوئے اسے دعا دی۔

”مت دیا کریں مجھے ایسی دعائیں آپ کی اولاد کو آپ کی دعا بددعا بن کر لگتی ہے۔“ طیبہ سخت قنوطیت کا شکار تھی۔ اسی وقت دروازہ دھڑک کر کھلا اور حواس باختہ انداز میں تیمور اندر داخل ہوا۔

”کیا بات ہے تیمور۔؟“ بڑی اماں اور طیبہ اس کا چہرہ دیکھ کر وہل گئیں۔

”صلاح الدین نے باہر ہنگامہ کھڑا کر دیا ہے۔“ وہ سخت بوکھلایا ہوا تھا۔

”لیکن کیوں۔؟“ شائستہ بیگم کا دل دھک کر کے رہ گیا۔

”وہ کہتا ہے کہ ابھی اور اسی وقت رخصتی کروا کر لے کر جائے گا۔“ تیمور نے کمرے میں دھماکا کیا تھا۔

طیبہ نے خوف زدہ نگاہوں سے اپنی ماں کا چہرہ دیکھا۔

”یہ کیا بات ہوئی۔ اس کی باپ نے تو گارنٹی دی تھی کہ طیبہ کو تعلیم مکمل ہونے سے پہلے رخصتی نہیں مانگیں گے۔“ شائستہ بیگم کو غصہ آیا۔

”وہ کہتا ہے کہ گارنٹی میں نے نہیں میرے باپ نے دی تھی جبکہ نکاح تو میرے ساتھ ہوا ہے۔“ تیمور کا چہرہ ضبط کی کوشش میں لال ہو رہا تھا۔ طیبہ وہل کر اپنی ماں کے ساتھ چمٹ گئی۔ اسی وقت کھلے دروازے سے ڈاکٹر جلال اندر داخل ہوئے۔ وہ خود بھی اچھے خاصے پریشان لگ رہے تھے۔

”یہ تیمور کیا کہہ رہا ہے، کیا کہا ہے صلاح الدین نے؟“ انہوں نے گھبرا کر اپنے شوہر سے پوچھا۔

”کمینگی کر رہا ہے وہ۔“ جلال صاحب فکر مند انداز میں ٹھنکنے لگے۔ شائستہ بیگم کو اندازہ ہو گیا تھا کہ معاملہ خاصا سنجیدہ ہے۔

”بھلا یہ کیسے ممکن ہے، ابھی تو طیبہ کا میڈیکل کا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ☆ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

پہلا سال ہے۔۔۔ وہ بوکھلا کر بولیں۔
 ”لیکن اب بات تو مانتی پڑے گی۔ وہ لان میں دھرتا
 دیے بیٹھا ہے اور ساری برادری کے لوگ اس کا ساتھ
 دے رہے ہیں۔“ ڈاکٹر جلال کی بات پر طیبہ کے
 چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

”بابا وعدہ خلائی کر رہے ہیں وہ لوگ۔۔۔“ تیمور ان
 کے سامنے آکھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل
 رہے تھے۔

”تو کیا طلاق کا ٹھہہ لگوا کر گھر میں بٹھالوں
 اسے۔۔۔“ وہ ایک دم بھڑک کر بولے۔

”دے دے طلاق“ طیبہ کو لڑکوں کی کمی نہیں
 ہے۔“ وہ پہلی دفعہ باپ کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

”تمہارا دماغ خراب ہے، میرا نہیں۔“ وہ
 استہزائیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے
 بولے۔

”تو ٹھیک ہے۔ اٹھا کر دے دیں اپنی بیٹی، ان جاہل
 جنگلی لوگوں کو۔۔۔“ تیمور کا منہ سرخ ہوا۔

”مجھے جو کرنا ہو گا کر لوں گا“ تم اپنے مشورے اپنے
 پاس رکھو۔“ جلال صاحب بھی طیبہ کے سسرال
 والوں کا غصہ اس پر اتار رہے تھے۔ جب کہ تیمور کو اپنی
 بہن طیبہ کا سما ہوا چہرہ طیش ولا رہا تھا۔

”ساری زندگی غلط ہی فیصلے کیے ہیں آپ نے، اسی
 وجہ سے ڈیزی گھر سے بھاگ گئی اور بہت اچھا کیا اس
 نے جو اس جہنم سے نکل گئی۔“ تیمور مشتعل انداز میں
 بولا۔ اور ڈیزی کے نام پر ڈاکٹر جلال کا دماغ گھوم گیا اور
 انہوں نے چٹاخ سے ایک تھپڑ پوری قوت سے تیمور
 کے منہ پر دے مارا۔ وہ جو اپنے ہی دھیان میں کھڑا تھا،
 پیچھے دیوار کے ساتھ برے طریقے سے جا ٹکرایا۔

بڑی اماں اور طیبہ حواس باختہ ہو گئیں، جب کہ
 تیمور کے ہونٹوں سے ایک باریک سی لہو کی لکیر ٹھوڑی
 کی طرف بہنے لگی۔ اس نے سخت متنفر نگاہوں سے
 اپنے باپ کی طرف دیکھا اور پاؤں پٹختا ہوا کمرے سے
 نکل گیا۔ اس وقت ڈاکٹر جلال کے گمان میں بھی نہیں
 تھا کہ کسی دن وہ ایسے ہی ان کی زندگیوں سے بھی نکل

جائے گا۔
 ”شرم آئی چاہیے آپ کو جو ان اولاد پر ایسے ہاتھ
 اٹھاتے ہوئے۔“ شائستہ بیگم بھڑک کر بولیں۔
 ”تم بھی اپنی زبان بند رکھو ورنہ۔۔۔“ انہوں نے
 انگلی اٹھا کر غصے سے دھمکی دی۔

”ایک دفعہ ہی ساری اولاد کو پھانسی کے پھندے پر
 لٹکا دیں، قطرہ قطرہ اپنی نفرت کا زہر کیوں پلا رہے ہیں
 انہیں۔“ وہ بھی اپنے حواس کھو بیٹھیں۔

”تم اپنا سامان پیگ کرو، میں بوا کو بھیج رہا ہوں مدد
 کے لیے۔“ انہوں نے طیبہ کی طرف دیکھ کر حکم دیا
 اور کمرے سے نکل گئے۔ ان کے جاتے ہی شائستہ
 بیگم، طیبہ کو گلے لگا کر بلند آواز سے رونے لگیں، ان
 کے بین سن کر گھر کے ملازم تک سہم گئے تھے۔

اس دن طیبہ نے جب اس گھر سے قدم نکالا تو
 ساتھ ہی اس کے دل سے اپنے باپ کے نام کی ساری
 محبت بھی پیس کہیں رہ گئی تھی، بس گلے شکوؤں کی
 ایک فصل یک کر تیار ہو گئی تھی۔ انہوں نے صلاح
 الدین کی حویلی میں قدم رکھ کر دوبارہ مڑ کر نہیں دیکھا۔
 ڈاکٹر جلال شروع شروع میں اس سے ملنے جاتے
 تھے، لیکن وہ انہیں دیکھ کر کمرے میں بند ہو جاتیں اور
 ان کے جانے کے بعد ہی دروازہ کھولتیں۔ حویلی میں
 طیبہ کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں ہوتا تھا، جلال
 صاحب تک یہ خبریں پہنچتی تو وہ بے چین ہو جاتے،
 صلاح الدین عجیب عیاش قسم کے مزاج کا حامل بندہ
 تھا، لیکن اس کے سر نے ایک وعدہ نبھایا تھا اور وہ
 طیبہ کی تعلیم کا تھا۔

اپنی میڈیکل کی تعلیم کے دوران وہ دو بیٹوں کی ماں
 بنیں اور پھر ہاؤس جاب کر کے انہوں نے اپنی میڈیکل
 کی ڈگری کو تالا لگا کر کسی ایچی کیس میں چھپا دیا تھا۔
 طیبہ نے پورے دس سال کے بعد اپنی ماں کی بیماری
 کے بعد دوبارہ اس گھر میں قدم رکھا تھا اور تب بھی اپنے
 باپ سے سلام دعا کیے بغیر واپس آگئی تھیں۔ بڑی اماں
 کے بار بار مجبور کرنے پر وہ کبھی کبھار میکے آ جاتی تھیں،
 لیکن باپ سے ناراضی کا پودا اب ایک تناور درخت کی

صورت اختیار کر چکا تھا۔ بڑے ابا، دل ہی دل میں طیبہ سے خاصے شرمندہ تھے اور اس چیز کا دوا کرنے کی کوشش کرتے، لیکن طیبہ کے دل پر جمی کدیورت کسی صورت بھی کم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ اس کا اپنے بھائی تیمور سے اس کی شادی کے بعد بھی رابطہ رہا اور وہ اکثر بندیا سے بھی فون پر بات کر لیتی تھی، اسے تیمور کی شادی سے کوئی مسئلہ نہیں تھا بلکہ بنیش کے ساتھ تیمور کی شادی نہ ہونے پر اس نے باقاعدہ شکرانے کے نوافل پڑھے تھے۔ اپنے بیٹوں اشعر اور سرمد کے جوان ہونے کے بعد طیبہ کے حالات خاصے بدل گئے تھے۔ سرمد کا اپنے ننھیال سے خاصا لگاؤ تھا اور وہ اکثر ہی بڑے ابا کے گھر میں پایا جاتا تھا جبکہ اشعر بی ایچ ڈی کرنے آسٹریلیا گیا ہوا تھا، لیکن طیبہ کے اپنے باپ کے ساتھ تعلقات اتنے سال گزرنے کے بعد بھی سرد مہری کا شکار تھے۔



بختاور اس دن الٹا ساؤنڈ کروا کر آئی تو کچھ چپ چپ سی تھی کیونکہ وہ ایک دفعہ پھر بیٹی کی ماں بننے جا رہی تھی، حالانکہ اسے نہ جانے کیوں یقین تھا کہ اس بار اللہ اسے اپنی نعمت سے نوازے گا۔ اس نے بے شمار دعائیں اور وظائف کیے تھے۔ اس خبر کے بعد وہ خاصی اداس تھی اور اس نے ہمیشہ کی طرح نیلم کے پی ٹی سی ایل نمبر پر کال ملائی اور بے اختیار اس کے سامنے رو پڑی۔

”بختاور یا گل تو نہیں ہو گئی ہو، تم سے مجھے اس جمالت کی ہرگز توقع نہیں تھی۔“ نیلم نے اسے جھاڑا تو وہ شرمندہ ہو گئی۔

”یار! اللہ نے پہلے بھی تو مجھے دو بیٹیاں دی تھیں کیا تھا جو اس بار۔“ بات کرتے کرتے اس کا دل بھر آیا۔ ”بختاور! اللہ جسے چاہتا ہے بیٹے دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بیٹیاں۔ تم نے یہ آیت نہیں پڑھی کیا۔“ نیلم نے اسے دلاسا دیتے ہوئے پوچھا۔

”پڑھی ہے یار، لیکن اس کے اختیار میں تو ہر چیز

ہے نا۔“ وہ ابھی بھی گلہ کرنے سے باز نہیں آئی۔

”تو پھر اللہ کی رضا میں خوش ہو جاؤ۔ وہ ان شاء اللہ تمہاری یہ خواہش بھی پورے کرے گا۔“ نیلم اسے نرم لفظوں میں سمجھا رہی تھی۔

”میں اپنے لیے نہیں ہاشم کے لیے کہہ رہی تھی۔“ اس نے فوراً ہی تصحیح کی۔

”اسے بھی پیار سے سمجھانا، وہ سمجھ جائے گا۔“ نیلم نے سنجیدگی سے کہا تو وہ سر ہلا کر رہ گئی، نیلم سے بات کر کے اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔ اسی لیے وہ مچن میں آکر رات کا کھانا تیار کرنے لگی۔

”خیر تو ہے، تم کچھ چپ چپ سی لگ رہی ہو مجھے۔“ ہاشم نے کھانا کھا کر نشو سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اس کا بھجا بھجا سا چہرہ دیکھا۔

”ویسے ہی کمر میں درد تھا میری۔“ بختاور نے نہ جانے کیوں یہ بات ہاشم سے چھپالی۔ وہ اسے وقت سے پہلے دل گرفتہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”تم سے ہزار دفعہ کہہ چکا ہوں کہ جاب چھوڑ دو، پتا نہیں تم کیوں ابھی تک اس جاب سے چمٹی ہوئی ہو۔“ وہ بے زاری سے گویا ہوا۔

”ہاں اسی ہفتے ریزائن کروں گی۔“ خلاف توقع وہ فوراً ہی مان گئی۔

”ایک فل ٹائم ملازمہ کا بھی بندوبست کیا ہے میں نے تمہارے لیے۔ تم دو سراسر اکمرہ اس کے لیے سیٹ کرو۔“ ہاشم کی اگلی بات نے اسے حیران کیا۔

”وہ کیوں بھلا۔۔۔؟“

”سارے دن میں گھر میں نہیں ہوتا، خدا نخواستہ تمہاری طبیعت خراب ہو گئی تو۔۔۔؟“ وہ پہلے کی طرح اس کا خیال کرنے لگا تھا۔

”اچھا ٹھیک ہے۔“ بختاور کا ذہن الجھا ہوا تھا اس لیے وہ بحث کیے بغیر مان گئی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

Downloaded From
Paksociety.com